الرّبانیہ

حیات بشری کا ربّانی طریقہ

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ہر چیز کا ایک رأس الامر ہوتا ہے۔ یعنی معاملہ کا سرا۔ ظاہری طور پر کوئی چیز مختلف روپ میں دکھائی دے سکتی ہے۔ مگر اس کا بنیادی تصور ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ اس کے تمام مظاہر اور اس کے دوسرے تمام پہلو اسی ایک بنیادی تصور یا رأس الامر سے جُڑ کر اپنے کل کا حصہ بنتے ہیں۔

کسی چیز کا جو رأس الامر ہو، اسی کے مطابق اس کے تمام معاملات انجام دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً تجارت کا رأس الامر نفع (profit) ہے۔ چنانچہ تجارت کی تمام کارروائیاں اسی بنیاد پر عمل میں لائی جاتی ہیں کہ ان سے نفع حاصل ہو۔ کوئی تاجر اگر اس رأس الامر کو کھو دے تو اس کی تمام تجارتی سرگرمیاں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ کسی اور اعتبار سے ان کی جو بھی اہمیت ہو، مگر تجارت کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔

اسی طرح دین کا ایک رأس الامر ہے، اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ قرآن کے مطابق، اللہ کا علم آدمی کے اندر خشیت کا مزاج پیدا کرتا ہے (فاطر ۲۸) آدمی کے اندر جب خوف کے درجہ میں اللہ سے تعلق پیدا ہو جائے تو اس کا تمام فکر و عمل درست ہو جاتا ہے۔ اور اگر خوف کے درجہ میں اللہ سے تعلق پیدا نہ ہو تو آدمی کا تمام فکر و عمل غلط ہو کر رہ جائے گا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ اللہ کا ڈر حکمت کا سرا ہے (رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ) ابوالعالیہ نے کہا کہ اللہ سے ڈرنے کا نام حکمت ہے، کیوں کہ اللہ کا ڈر تمام حکمت کا سرا ہے (الحکمۃ خشیۃ اللہ فان خشیۃ اللہ رأس کل حکمۃ) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳۲۲

قرآن میں حکمت کو خیر کثیر کہا گیا ہے (البقرہ ۲۶۹) اس کی تشریح کرتے ہوئے الربیع بن انس نے کہا کہ حکمت اللہ کا خوف ہے (الحکمۃ الخشیۃ) الحسن نے کہا کہ حکمت پرہیز گاری ہے (الحکمۃ الورع) تفسیر القرطبی ۳/ ۳۳۰

انسانی نفسیات کے اعتبار سے، خوف سب سے زیادہ طاقت ور محرک ہے۔ خوف سب سے بڑا عامل ہے جو انسان کی پوری شخصیت کو کسی ایک رخ پر سرگرم کر دیتا ہے۔ دین کا اقرار کرنے والوں کے ذہن میں اگر یہ رأس الامر (خوفِ خدا) پوری طرح واضح ہو تو ان کی تمام دینی سرگرمیاں صحیح رخ پر جاری

ہوں گی۔اور اگر یہ راْس الامر ان کے ذہن سے اوجھل ہو جائے تو ان کی دینی سرگرمیاں بھی غیر متعلق راہوں میں بھٹک کر رہ جائیں گی۔ بظاہر باعمل ہو کر بھی وہ حقیقی دین کے اعتبار سے بے عمل قرار پائیں گے۔

خوفِ خدا کو راْس الامر ماننے کے بعد یہ ہوگا کہ اہل دین کے اندر اپنا محاسبہ کرنے کا مزاج پیدا ہو گا۔ وہ موت کو زیادہ سے زیادہ یاد کریں گے۔ اللہ کی عدالت میں پیشی کو سوچ کر ان کی روح کانپ اٹھے گی۔ وہ زیادہ سے زیادہ کوشش کریں گے کہ اپنے قول اور اپنے عمل کو درست کریں تاکہ قیامت میں اللہ کی پکڑ سے بچ سکیں۔

خوفِ خدا کو راْس الامر سمجھنے کا دوسرا اظہار وہ ہے جو غیر قوموں کے معاملہ میں پیش آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی نظر میں دوسری قوموں پر کرنے کا جو سب سے بڑا کام دکھائی دے گا وہ انذار و تبشیر ہے۔ یعنی ان کو یہ یاد دلانا کہ تم اللہ کے بندے ہو۔ تم کو دنیا میں اللہ کا اطاعت گزار بن کر رہنا ہے۔ اگر تم نے اطاعت گزاری کے بجائے نافرمانی کا رویہ اختیار کیا تو قیامت میں تم اللہ کی پکڑ کی زد میں آجاؤ گے۔ اور پھر کوئی بچانے والا نہ ہوگا جو تم کو بچا سکے۔ اس انذار و تبشیر کی اہمیت ان کی نظر میں اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی خاطر وہ ہر دوسری چیز کو ناقابل لحاظ قرار دے کر اس کو نظر انداز کر دیں گے۔

یہ راْس الامر آدمی کی پوری زندگی کو تقویٰ رخی بنا دے گا۔ ایسا آدمی جو عمل بھی کرے گا، خواہ یہ عمل دنیا کی نسبت سے ہو یا دین کی نسبت سے، سب کا سب تقویٰ میں نہایا ہوا ہو گا۔ اس کی ہر سرگرمی خوفِ خدا کے بنیادی تصور سے جڑی ہوئی ہوگی۔ اس کا پورا نقشۂ حیات خوفِ خدا پر مبنی نقشۂ حیات ہو گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی معرفت آدمی کو ڈرنے والا انسان بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچا دین آدمی کے اندر ذاتی اعتبار سے محاسبۂ خویش کا ذہن ابھارتا ہے، اور دوسروں کے اعتبار سے انذار آخرت کا ذہن۔ دین دار انسان کی پوری زندگی جس مرکزی تصور کے تحت ڈھلتی ہے وہ یہی اللہ کا خوف ہے۔ سچا دین دار وہی ہے جو دینِ خشیت پر قائم ہو گیا ہو۔

وحیدالدین

۱۹ اپریل ۱۹۹۱

اسلام کیا ہے

اسلام کیا ہے

دنیا تعمیرِ حیات کی جگہ نہیں، دنیا امتحانِ حیات کی جگہ ہے ——— یہی ایک لفظ میں اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

اللہ نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس نے دو دنیائیں بنائیں۔ ایک، موجودہ دنیا۔ اور دوسری موت کے بعد سامنے آنے والی دنیا۔ اللہ نے موجودہ دنیا کو انسان کے لیے عارضی قیام گاہ بنایا جہاں اس کا امتحان لیا جائے۔ اور اگلی دنیا کو انسان کی ابدی قیام گاہ بنایا جہاں وہ ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ زندگی گزارے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی حالتِ امتحان میں ہے۔ موجودہ دنیا منزل نہیں ہے، وہ صرف راستہ ہے۔ جو لوگ آج کی زندگی میں اپنے امتحان میں پورے اتریں، وہ موت کے بعد ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ اس دنیوی امتحان میں پورے نہ اُتریں، وہ ہمیشہ کے لیے جہنّم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

یہ امتحان کیا ہے۔ یہ آزادی کے استعمال کا امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان آزاد ہے۔ مگر یہ آزادی انسان کا حق نہیں، وہ اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ اسی پرچہ کے حل پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انسان کو آزادی دے کر اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون آزادی کا غلط استعمال۔

انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی عبدیت اور اللہ کی معبودیت کا اعتراف کرے۔ وہ سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کی ماتحتی میں دیدے۔ جو آدمی اس طرح اللہ والا بن جائے، اس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ وہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ بندوں کے حقوق ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ انانیت کا طریقہ چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔

عام انسان کی زندگی دنیا پسند زندگی ہوتی ہے۔ مگر اللہ پر ایمان لانے والے کی زندگی آخرت پسند زندگی بن جاتی ہے۔ عام انسان اپنی ذات کے لیے جیتا ہے۔ مومن انسان وہ ہے جو اللہ رب العالمین کے لیے جینے لگے۔

لیس کمثلہ شئ

قرآن میں خدا کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس کے مثل کوئی چیز نہیں (الشوریٰ ۱۱) خدا ہر اعتبار سے ایک برتر ہستی ہے۔ اس کا برتر ہونا ہی اس کو یہ حیثیت دیتا ہے کہ وہ تمام موجودات کا خدا ٹھہرے۔ سب کے سب اس کے آگے جھک جائیں۔ سب کے سب اس کو اپنا بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں چھوٹا بننے پر راضی ہو جائیں۔

خدا اپنی ذات میں قائم ہے۔ انسان پیدا کیے جانے سے پیدا ہوا ہے۔ مگر خدا اس سے بلند ہے کہ کوئی اس کو پیدا کرے۔ خدا کا وجود ایک مستقل وجود ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ایک ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ اس کے برابر کوئی نہیں۔

خدا "نہیں" سے "ہے" کو برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمام غیر موجود چیزوں کو موجود کیا۔ مادہ اور حرکت اور روشنی اور توانائی اور شعور کی صورت میں جو کچھ آج کائنات میں نظر آتا ہے، وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو وجود بخشا ہے۔

خدا غیب کا علم رکھتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے ساتھ مستقبل کو بھی پوری طرح جانتا ہے۔ خدا کی اسی صفت خاص کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ وہ کائنات کی ایسی منصوبہ بندی کرے کہ اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے متوافق ہوں۔ ان میں ابدی طور پر کسی نقص کا ظہور نہ ہو سکے۔

خدا ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ نیند اور تکان اور کمزوری سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ وہ اپنی وسیع کائنات کا مسلسل نظم کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بلین سال گزرنے کے بعد بھی کائنات کی حرکت برابر جاری ہے۔ اس میں کبھی وقفہ نہیں پڑا۔ اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

خدا ایک صاحب قوت ہستی ہے۔ خدا اگر صاحب قوت نہ ہو تو انسان کے پاس قوت کہاں سے آئے۔ خدا تمام چیزوں کو دیکھنے والا ہے۔ خدا اگر نہ دیکھے تو انسان بھی دیکھنے سے محروم رہے۔ خدا شعور اور ادراک کا مالک ہے۔ خدا اگر شعور اور ادراک کا مالک نہ ہو تو انسان کے پاس نہ شعور ہوگا اور نہ وہ کسی چیز کا ادراک کر سکے گا۔ خدا سب کچھ ہے۔ خدا ان صفات کا مالک بھی ہے جن کو ہم جانتے ہیں اور ان صفات کا مالک بھی جن کو ہم نہیں جانتے۔ موجودہ دنیا میں خدا کی خالقیت کا ظہور ہوا ہے، آخرت میں خدا کی حاکمیت اپنی کھلی ہوئی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

محمد رسول اللہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قدیم مکہ میں پیدا ہوئے تو وہاں شرک چھایا ہوا تھا۔ تمام مفادات شرک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مگر آپ نے اپنے آپ کو ماحول سے اوپر اٹھایا۔ حالات سے موافقت کرنے کے بجائے آپ نے اپنے کو تلاش حق کی راہ میں لگا دیا۔ اللہ نے آپ کی مدد فرمائی۔ آپ کو سچائی کی ہدایت ملی اور مزید انعام کے طور پر نبوت بھی عطا کی گئی۔

آپ خدا کے سچے عبادت گزار بن گئے۔ آپ نے اپنے تمام اعلیٰ جذبات کا مرکز صرف ایک خدا کو بنالیا۔ آپ نے اپنے پورے وجود کو خدا کے حوالے کر دیا۔ نہ صرف دن میں بلکہ راتوں میں بھی آپ خدا کی عبادت کرتے۔ نہ صرف لوگوں کے سامنے بلکہ تنہائی میں بھی آپ خدا کے خاشع بنے رہتے۔

آپ نے بلند کرداری کو اپنا اخلاق بنایا۔ لوگوں کے برے سلوک کے باوجود آپ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے۔ لوگ آپ کو تکلیف پہنچاتے مگر آپ ان کے حق میں دعا دیتے۔ آپ نے ظالموں کے ظلم پر صبر کیا۔ آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔

آپ کے لیے اپنے وطن میں رہنا ناممکن بنا دیا گیا۔ آپ کو مجبوراً اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ آپ مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ آپ نے فرار کو ہجرت میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے خلاف لوگوں نے جنگ کی طاقت کا مظاہرہ کیا مگر آپ نے بے پناہ عزم کے ساتھ بتایا کہ امن کی طاقت جنگ کی طاقت سے بھی زیادہ بڑی ہے۔

آپ کو مقبولیت ملی مگر آپ نے فخر نہیں کیا۔ آپ کے پاس دولت آئی مگر آپ عیش سے دور رہے۔ آپ کو حکومت دی گئی مگر اس نے صرف آپ کی تواضع میں اضافہ کیا۔ آپ کو ہر قسم کی بلندیاں ملیں مگر آپ نے عجز اور عبدیت کو اپنا شعار بنایا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر قسم کے لمحات آئے اور زندگی کے تمام تجربات گزرے۔ آپ معاشی تنگی کے دور سے بھی گزرے اور فراخی اور آسودگی کے دور سے بھی۔ آپ کو صحت کا تجربہ بھی ہوا اور بیماری کا تجربہ بھی۔ آپ کا سابقہ تعریف کرنے والوں سے بھی پیش آیا اور تنقید کرنے والوں سے بھی۔ آپ کو اپنی زندگی میں دشمن بھی ملے اور دوست بھی۔ آپ شکست سے بھی دوچار ہوئے اور آپ نے عظیم کامیابی بھی حاصل کی۔ مگر ہر حال میں آپ اعتدال پر قائم رہے۔ ہر حال میں آپ اللہ کے صابر اور شاکر بندہ بنے رہے۔

پیغمبر اعظم

محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ آپ نبوت کی فہرست کی آخری کڑی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیوں کو بھیجنے سے جو مقاصد مطلوب تھے، وہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ آخری طور پر مکمل کر دیے۔ اسی لیے آپ آخری نبی قرار پائے۔ آپ کے بعد اب مزید کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نبوت کے تمام مقاصد کی تکمیل ہونا صرف شخصی عقیدہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک معلوم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا ہے۔ امریکی پروفیسر مائیکل ہارٹ نے آپ کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہا ہے۔ کروروں اہل اسلام آپ کو تمام پیغمبروں میں سب سے اعظم اور افضل پیغمبر مانتے ہیں۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے، سب توحید کا پیغام لے کر آئے۔ مگر آپ سے پہلے تمام پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا پیغام صرف دعوتی مرحلہ میں رہا۔ وہ انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہونچا۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی مدد سے اس کو عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہونچا دیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے دین میں تحریفات ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی پیغمبر کا دین بھی تحریف سے خالی نہ رہا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ نبوت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ خدا کا دین تحریفات سے پاک ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین کی صورت میں قائم ہو گیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہب نزاعی دور میں تھا۔ مذہب کے ساتھ وہ حقائق جمع نہیں ہوئے تھے جو اس کو ایک تاریخی مسلمہ بنا دیں۔ آپ کے ذریعہ یہ عظیم کارنامہ انجام پایا کہ مذہب کی تحریک نزاعی مذہب کے دور سے نکل کر مسلمہ مذہب کے دور میں داخل ہو گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مذہبی تعلیمات کی پشت پر ایک حقیقی عملی تاریخ موجود نہ تھی۔ آپ اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ پہلی بار ایسا ہوا کہ مذہب کی اعلیٰ تعلیمات مجرد تعلیمات نہ رہیں بلکہ ان کے پیچھے ہر اعتبار سے ایک مکمل واقعاتی تاریخ موجود ہو گئی ــــــ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں بولا ہوا ہر لفظ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے نہ کہ فرضی نوعیت کا صرف ایک شخصی عقیدہ۔

اصحابِ رسولؐ

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو وہ ان کے ایک مُد یا اس کے نصف کے صدقہ کے برابر بھی نہیں پہونچے گا (لاتسبّوا اصحابی فوالذی نفسی بیدہ لو ان احدکم انفق مثل احد ذہبا مابلغ مدّ احدھم ولانصیفہ، متفق علیہ)

اصحابِ رسول کی یہ عظمت کسی پُراسرار تقدس کی بنا پر نہیں ہے، اس کی ایک معلوم اور معقول وجہ ہے، اور وہ وہی ہے جو قرآن میں واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ وجہ ہے "فتح" سے پہلے ایمان لانا اور قربانیاں دینا۔ (الحدید ۱۰)

غلبہ اور فتح سے پہلے رسول کی حیثیت بس ایک عام انسان کی تھی۔ اس وقت تک آپ کی حیثیتِ رسالت ثابت شدہ نہیں بنی تھی، وہ تاریخی طور پر معتبر اور مسلّم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت رسول کو پہچاننے اور اس پر فدا ہونے کے لیے وہ خاص نظر درکار تھی جو کسی چیز کو محض جوہر کی سطح پر پہچان لیتی ہے۔ اس وقت آپ کا ساتھ دینے کے لیے وہ انوکھا حوصلہ درکار تھا جو ایسے وقت میں ایک صاحبِ حق کا ساتھ دے جس کا ساتھ دینا پورے سماج میں نکّو بن جانے کے ہم معنی ہو۔ جو اس وقت قربانی پیش کرے جب کہ قربانی پیش کرنے کا کوئی کریڈٹ اس کو نہ مل رہا ہو۔

سورہ ہود میں ہے کہ پیغمبر کا انکار کرنے والوں نے کہا کہ ہم تمہارے اندر کوئی "فضل" نہیں دیکھتے۔ پیغمبر نے جواب دیا، کیا تم کو "بینہ" دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ہر دور میں داعیانِ حق کو پہچاننے میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اپنی ظاہر بینی کی وجہ سے داعیِ حق کو دنیوی بڑائی کی زمین پر دیکھنا چاہتے ہیں، جب کہ حق کا داعی ہمیشہ دلیل کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ صحابہ تاریخ کے وہ نادر گروہ ہیں جنھوں نے پیغمبر کو اس وقت پہچانا جب کہ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے نظری دلیل کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ان کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے ان کو تاریخ میں امتیازی درجہ دے دیا۔

توحید اور شرک

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک خدا کی سطح پر جینے والا۔ دوسرا غیر خدا کی سطح پر جینے والا۔ پہلا انسان مذہب توحید پر ہے اور دوسرا انسان مذہب شرک پر۔ پہلے انسان کا نام موحد ہے اور دوسرے انسان کا نام مشرک۔

یہ فرق اس اعتبار سے پیدا ہوتا ہے کہ کون آدمی کس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے، کون آدمی کس کی عظمتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہے، کون آدمی کس چیز کو اپنی زندگی میں آخری درجہ دیے ہوئے ہے۔ اسی نفسیاتی حالت کو مذہب کی اصطلاح میں عقیدہ کہا جاتا ہے یہی عقیدہ کا فرق ایک انسان کو دوسرے انسان سے الگ کر دیتا ہے۔ ایک قسم کے عقیدہ والا خدا پرست بن جاتا ہے اور دوسرے قسم کے عقیدہ والا غیر خدا پرست۔

جو انسان خدا کے عقیدہ پر ہو وہ خدا کی بڑائیوں میں جینے والا انسان ہوتا ہے۔ اس کی محبتیں اور اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی یادوں میں خدا کا وجود سمایا ہوا ہوتا ہے، وہ خدا کی آنکھ سے دیکھتا ہے، وہ خدا کے کان سے سنتا ہے اور خدا کے ذہن سے سوچتا ہے، اس کے تمام اقوال اور افعال پر خدا کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جس چیز کو چھوڑتا ہے خدا کے لیے چھوڑتا ہے، وہ جس چیز کو اختیار کرتا ہے خدا کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خدا میں جینے والا انسان بن جاتا ہے۔

جو انسان شرک کے عقیدہ پر ہو اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں دوسری دوسری چیزوں کی عظمتیں سمائی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ دوسری چیزیں خواہ سورج اور چاند ہوں، خواہ وہ مفروضہ روحیں ہوں، خواہ وہ قوم کے بزرگ اور اکابر ہوں، خواہ وہ اس کی اپنی ذات یا اس کے بیوی بچے ہوں۔ ایسے انسان کا ذہن ہمیشہ انھیں غیر خدائی چیزوں پر چلتا ہے، وہ انھیں کی یادوں میں تڑپتا ہے۔ اس کے حوصلے اور عزائم ہمیشہ انھیں چیزوں کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا غم اور اس کی خوشی سب انھیں چیزوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یہی چیزیں اس کی زندگی کا رُخ متعین کرتی ہیں۔

اسلامی عبادتیں

اسلام کی جو عبادتیں ہیں، ان کی اگرچہ ایک ظاہری شکل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی ایک اسپرٹ (روح) ہے اور تمام عبادتیں اصلاً اپنی اسی اسپرٹ کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔

نماز کی اسپرٹ تواضع ہے۔ نماز میں اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہنا اور پھر سجدہ میں گر کر زمین پر اپنا سر رکھ دینا، اس بات کا اقرار ہے کہ اس دنیا میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ بندہ کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہ اقرار آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ مسجد سے نکل کر جب وہ انسانوں کے درمیان آتا ہے تو ان سے معاملہ کرنے میں اس کا انداز تواضع کا ہوتا ہے نہ کہ غرور اور گھمنڈ کا۔

روزہ کی اسپرٹ برداشت ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ناگزیر ضروریات زندگی کے معاملہ میں برداشت کا طریقہ اختیار کرکے آدمی اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ سماج کے اندر تحمل اور برداشت کے ساتھ رہے، جذبات ابھارنے والے مواقع پر وہ بے قابو ہونے سے بچے۔

زکوٰۃ کی اسپرٹ خیر خواہی ہے۔ زکوٰۃ میں آدمی اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دے کر اپنے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھے، دوسروں کی ضرورت کے وقت وہ ان کے کام آئے۔

حج کی اسپرٹ اتحاد ہے۔ حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے متحدہ طور پر عبادتی امور انجام دیتے ہیں۔ یہ اتحاد و اتفاق کا سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں۔ وہ مل جل کر رہیں۔ اختلافات میں اُلجھنے کے بجائے وہ متحد اور متفق ہوکر زندگی گزاریں۔

انسان کا جسم باقی رہے، مگر اس کی روح نکل جائے تو ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ اسی طرح جس عبادت کی شکل موجود ہو مگر اس کی روح اس میں نہ پائی جاتی ہو تو ایسی عبادت مُردہ عبادت ہے۔ اس سے وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو زندہ عبادت سے عبادت کرنے والے کو ملتا ہے۔

مومن کون

لوگ چیزوں کو دیکھتے ہیں، مومن چیزوں میں خدا کو دیکھتا ہے۔ لوگ چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، مومن وہ ہے جو چیزوں سے گزر کر خدا تک پہونچ جائے۔ پھل کو درخت سے گرتے ہوئے ہر شخص نے دیکھا ہے۔ مگر جس نے درخت سے پھل گرنے کے واقعہ میں گریویٹی (قوتِ کشش) کو دیکھا وہ نیوٹن بن گیا۔ میٹر (مادہ) کو ہر شخص دیکھتا ہے، مگر جس نے میٹر میں الکٹران کی حرکت کو دیکھا وہ مائیکل فریڈے بن گیا۔ ذرہ ہر جگہ ہے اور ہر شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔ مگر جس نے ذرہ میں نیوکلیر فورس (جوہری طاقت) کو دیکھا وہ آئن سٹائن بن گیا۔ اسی طرح دنیا کو ہر شخص دیکھتا ہے مگر جو شخص دنیا میں خدا کو دیکھ لے وہی مومن ہے۔

بائبل میں ایک تمثیل دی گئی ہے کہ جس کے پاس سننے کے لیے کان ہوں وہ سن لے۔ پس اس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں۔ وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں:

ہم نے تمہارے لیے بانسری بجائی، اور تم نہ ناچے۔ ہم نے تمہارے لیے ماتم کیا اور تم نہ روئے۔

خدا اس دنیا میں ہر وقت اپنی بانسری بجا رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان اس کو سنے اور اس سے سرشار ہو کر رقص کرے۔ مگر انسان عین اس خدائی بانسری کے درمیان بے حس اور بے خبر بنا ہوا پڑا رہتا ہے۔ خدا اس دنیا میں ایسے واقعات ظاہر کرتا ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر تڑپ اٹھیں، لوگ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کریں۔ مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ تڑپانے والے واقعات کو دیکھ کر بھی وہ نہیں تڑپتا، رلانے والے واقعات سے دوچار ہونے کے باوجود وہ نہیں روتا۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ مگر انسان اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ آج انسان ایک لفظ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ کل وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ ساری کائنات دے کر بھی چھوٹ نہ سکے گا۔ کیسا عجیب ہے انسان کا آج، اور کیسا عجیب ہوگا انسان کا کل جس کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔

تقویٰ اور اخلاق

سُئِلَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن اکثرِ ما یُدخل الناس الجنۃ۔ قال: تقوی اللّٰہ وحُسن الخُلق (رواہ الترمذی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا ڈر، اور اچھا اخلاق۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ دنیا میں اس کو دوسرے انسانوں کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی بیک وقت دو تعلق کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک خدا سے تعلق۔ اور دوسرا، انسانوں سے تعلق۔ اس اعتبار سے انسان کے امتحان کے دو پہلو ہو جاتے ہیں۔ اور امتحان کے ان دونوں پرچوں میں اس کو پورا اترنا ہے۔

خدا کی نسبت سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی خدا کو اپنا خالق ومالک سمجھے۔ وہ خدا کی عظمتوں کے احساس سے سرشار ہو۔ اس عقیدہ اور اس احساس سے کسی کے اندر جو قلبی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔

خدا بڑا ہے، انسان چھوٹا ہے۔ خدا قادر ہے، انسان عاجز ہے۔ خدا دینے والا ہے، انسان پانے والا ہے۔ ان حقیقتوں کا شعور آدمی کے اندر اعتراف اور تواضع اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر سرکشی کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی محبت اور خوف کے جذبات کے تحت دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

اس قسم کا انسان جب دوسرے انسانوں کے درمیان آتا ہے، تو ان سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی پوری روش حسنِ اخلاق میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کا بول تواضع کا بول ہوتا ہے۔ اس کا عمل انصاف کا عمل ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کی طرح زندگی گزارنے لگتا ہے جو یہ دیکھ رہا ہو کہ اس کے اوپر اس کا خدا کھڑا ہوا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ اس کے ہر قول وفعل کا حساب لینے والا ہے۔ ایسے انسان سے جو اخلاق ظاہر ہو، اسی کا نام حُسنِ خُلق ہے۔

جو آدمی ان دونوں امتحانوں میں پورا اترے، وہی وہ شخص ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

حسرت کا دن

قرآن میں قیامت کے دن کو ندامت اور حسرت کا دن (مریم ۳۹) کہا گیا ہے۔ قیامت کے دن جب تمام حقیقتیں کھلیں گی تو آدمی اچانک محسوس کرے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے قیمتی مواقع تھے جب کہ وہ خدا پرستی کا ثبوت دے کر آخرت میں اس کا انعام پا سکتا تھا۔ مگر اس وقت اس نے یہ مواقع کھودیئے اور اب یہ مواقع کبھی اس کے لیے آنے والے نہیں۔ مواقع کو کھونے کا یہ احساس بلاشبہ سب سے بڑی نفسیاتی سزا ہوگی جو ابدی طور پر آدمی کو تڑپاتی رہے گی۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وانہ لتذکرۃ للمتقین۔ وانا لنعلم ان منکم مکذبین۔ وانہ لحسرۃ علی الکافرین (الحاقۃ ۴۸ - ۵۰)

اور بلاشبہ یہ یاد دہانی ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ منکروں کے لیے پچھتاوا ہے۔

دنیا میں بار بار آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جب کہ وہ ایک عمل کر کے آخرت کا انعام حاصل کر سکے۔ مگر آدمی ظلم اور علو (النمل ۱۴) کی بنا پر مطلوبہ عمل نہیں کرتا۔ ایسے لوگ جب دنیا سے نکل کر آخرت میں پہونچیں گے تو اچانک وہ محسوس کریں گے کہ یہاں ان کے لیے حسرت اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب ایک ایک کر کے انھیں وہ گزرے ہوئے لمحات یاد آئیں گے جب کہ ان کے سامنے آخرت کے لیے عمل کرنے کا ایک موقع آیا، مگر انھوں نے اس موقع کو بیدردانہ طور پر کھو دیا۔

اس وقت آدمی کہے گا کہ آہ، میرے سامنے امر حق ظاہر ہوا جس کا ساتھ دے کر میں حق کا اعتراف کرنے والا بن سکتا تھا۔ مجھے موقع ملا کہ میں حق کو اس کے حقدار کے حوالہ کر دوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں حق کی گواہی دینے والا بنوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں درست بات کہوں، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مجھے موقع ملا کہ میں ان لوگوں میں بنوں جو خدا کے خوف سے اپنی زبان بند کر لیتے ہیں، مگر ان مواقع کو میں نے کھو دیا۔ میں اپنے آپ کو خدا کے مطلوب بندوں کی فہرست میں درج نہ کرا سکا۔ میں نے دنیا میں نیکی کے مواقع کو کھویا تھا، اس لیے آخرت میں انعام کے مواقع میں بھی اب میرا کوئی حصہ نہیں۔

دعا

اللّٰھم انی اعوذ بك من الفقر والقلة والذلة واعوذ بك من ان اَظلِمَ او اُظلَمَ۔

(نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں محتاجی سے اور کمی سے اور ذلت سے۔ اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔

دعا آدمی کی تڑپ کا اظہار ہے۔ دعا یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کے لیے بے پناہ خواہش مند ہو، وہ اپنا پورا وجود اس کے لیے لگائے ہوئے ہو۔ اور پھر اسی کو وہ اپنے رب سے بھی مانگے۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی چیز میں لگا دے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی کا وہ چرچا کرتا ہے، اسی کے لیے دعائیں اس کی زبان سے جاری ہونے لگتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا سنجیدگی کی آخری حد پر جا کر نکلتی ہے۔ اب جو شخص حقیقی معنوں میں محتاجی سے بچنا چاہتا ہو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ خود ایسا عمل کرے جو اس کو محتاجی کی طرف لے جانے والا ہو۔ جو شخص ناداری کو ایک نازک امتحان سمجھتا ہو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو نادار بنانے والا عمل نہیں کرے گا۔ جو شخص ذلت سے ڈرتا ہو وہ کبھی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ذلت کی حالت میں جا پڑے۔ جو آدمی اپنے آپ کو ظالم کے خانہ میں نہ دیکھنا چاہتا ہو وہ کبھی خود سے ظالمانہ کارروائی نہیں کرے گا۔ جو شخص اپنے آپ کو مظلومی کی حالت میں دیکھنا نہ چاہے وہ ایسے معاملہ میں کبھی نہیں کود سکتا جو نتیجۃً اس کو مظلومی کی حالت میں پہونچا دینے والا ہو۔

جو شخص اپنی دعا میں سنجیدہ ہو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ جس چیز سے بچنے کے لیے وہ خدا سے دعا کرے، دعا کے بعد وہ خود اسی چیز میں ملوث ہو جائے۔ خدا سے وہ مشرق کی سمت میں سفر کی توفیق مانگے اور دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی سواری مغرب کی سمت میں دوڑا دے۔

ربّانی انسان

ربّانی انسان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور نبوّت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم ربّانی بنو (كُونُوا رَبَّانِيِّينَ) آل عمران ۷۹

ربانی کا مطلب ہے رب والا، اللہ والا، خدا پرست۔ یہ ایک مومن کی شخصیت کو بتانے کے لیے نہایت صحیح اور بامعنی لفظ ہے۔ پیغمبر کی دعوت، ایک لفظ میں، یہی ہوتی ہے کہ اے لوگو، تم اپنے آپ کو ربّانی انسان بناؤ۔ جو لوگ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرتے ہیں ان کی خاص صفت یہی ہے کہ وہ اللہ والے انسان بن جاتے ہیں۔ ایمان کے نتیجہ میں ان کے اندر جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ربّانی شخصیت ہوتی ہے۔

ہر آدمی جو اس دنیا میں ہے، اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی رخ ہوتا ہے۔ اس کا پورا وجود اسی رخ پر چلتا ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اس کا ذہن اسی مخصوص رخ پر سوچتا ہے۔ وہ عمل کرتا ہے تو اس کا عمل تمام کا تمام اسی مخصوص رخ کی طرف ہوتا ہے۔ وہ بولتا ہے تو اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اسی کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ہر اعتبار سے اس کی توجہ اسی کی طرف لگ جاتی ہے۔

مومن وہ ہے جس کی زندگی کا رخ پوری طرح خدا کی طرف ہو جائے۔ اس کی سوچ خدا کی سمت میں چلے۔ اس کے جذبات خدا کے لیے متحرک ہوتے ہوں۔ صرف ایک خدا اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور بنا ہوا ہو۔ اس کا کلام خدا کے عظمت و جلال کے احساس کے تحت نکلا ہوا کلام ہو۔ خدا کی یاد اس کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے۔

مومن انسان خدا پرست انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی شرکت کے بغیر صرف ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنالیتا ہے۔ وہ اسی خدا کی یادوں کے ساتھ جیتا ہے اور اسی خدا کی یادوں کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اس زندگی کو ایک لفظ میں، خدا رخی (God-oriented) زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا انسان ہر طرف سے یکسو ہو کر خدا میں جُڑ جاتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کے تمام تقاضوں کے لیے خدا کو اپنا مطلوب بنالیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ربّانی انسان بن جاتا ہے۔

صاحبِ معرفت

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور کلام سے عاجز ہونا ایمان میں سے ہے۔ (الحیاء والعیّ من الایمان) بعض صوفیار کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ کی پہچان ہو جائے، اس کی زبان گویائی سے تھک جائے گی (من عرف اللہ کلّ لسانہ)

جس طرح خالی برتن زیادہ آواز دیتا ہے، اور جو برتن بھرا ہوا ہو اس میں آواز کم ہو جاتی ہے۔ کم پانی میں پتھر پھینکیں تو بہت زیادہ تموج ہوگا۔ مگر سمندر میں پتھر پھینکئے تو اس میں اس کی وجہ سے کوئی تموج نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ خالی انسان زیادہ بولتا ہے اور بھرا ہوا انسان ہمیشہ کم بولتا ہے۔

اللہ کی معرفت سب سے بڑی حقیقت کی معرفت ہے۔ آدمی جب اللہ کو اس کی اتھاہ عظمتوں اور اس کے بے پایاں کمالات کے ساتھ پاتا ہے تو اپنا وجود اس کو بالکل حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں میں کچھ نہیں ہوں۔ یہ احساسِ فروتنی اس کی زبان کو بند کر دیتا ہے۔ وہ حیرانی کی کیفیت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

مزید یہ کہ اللہ کی معرفت آدمی کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کے شعور کو جگاتی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہر ہر کام اور ہر ہر بول کا مجھے قادرِ مطلق کے سامنے حساب دینا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ناپ تول کر بولے۔ وہ کہنے سے پہلے سوچے اور اظہار سے پہلے احتساب کرے۔ خدا کی معرفت آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتی ہے، اور سنجیدگی، عین اپنے مزاج کے مطابق، آدمی کو خاموش کر دیتی ہے۔

خاموشی کوئی سلبی کیفیت نہیں، وہ عین ایجابی عمل ہے۔ خاموش آدمی یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ گہرا آدمی ہے۔ وہ بلند تر حقیقتوں کو پائے ہوئے ہے۔ خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ کرنے سے پہلے اپنے کرنے کو تولتا ہے۔ خاموشی فرشتوں کے ساتھ مشابہت ہے۔ کیوں کہ فرشتے خاموش زبان میں بولتے ہیں۔ جس آدمی کو فرشتوں کی ہم نشینی حاصل ہو جائے، وہ خاموش زیادہ دکھائی دے گا اور بولتا ہوا کم۔

اسلامی کردار

خدا سب سے بڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل ہستی ہے۔ آدمی جب ایسے خدا کو پاتا ہے تو خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا احساس اس کی نفسیات کو بالکل بدل دیتا ہے۔ اس کی اس نفسیات کا اظہار اس کی روزمرہ کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس کی دینی سرگرمیوں میں بھی۔

ایسا آدمی بالکل فطری طور پر تواضع اور انکسار کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی باتوں میں مٹھاس اور اس کے عمل میں نرمی پائی جاتی ہے۔ اس سے کسی کو شر کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ انصاف کے حدود کا پابند رہے گا اور اپنے لئے اس چیز کا مطالبہ کرے گا جو فی الواقع اس کا اپنا ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کا حق ادا کرتا ہے اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کا فوراً اعتراف کرلے۔ وہ حسد اور گھمنڈ سے خالی ہوتا ہے۔ کسی کی خوبی کا اعتراف کرنے میں اس کا دل تنگ نہیں ہوتا۔ اس کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ کسی کے اندر عیب دیکھے تو اس کو چھپالے کسی سے قصور ہو جائے تو اس کے قصور کو معاف کر دے۔ اس کی ذات کو کسی سے دکھ پہنچے تو اس کے اندر انتقام کی آگ نہیں بھڑکتی۔ وہ دوسروں کے کام آکر خوش ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتا ہے نہ کہ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے۔ وہ تعریف و تنقید سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔

ایسا آدمی جب خدا کے لئے اٹھتا ہے تو اس کے مدعوئین کو اس کی طرف سے خدائی اخلاقیات کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں لوگوں کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ شریف اور بردبار ہوتا ہے وہ خدا پر بھروسہ کرنے والا ہوتا ہے اور جو کچھ ملے اس پر قناعت کرنے والا۔ وہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان حق اور ناحق کی بنیاد پر فرق کرتا ہے نہ کہ اس بنیاد پر کہ کون اس کا اپنا ہے اور کون اس کا اپنا نہیں۔

مومن کیسا ہوتا ہے

مومن وہ ہے جو خدا کو اس حیثیت سے پالے کہ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کا مرکز صرف ایک خدا کو بنالے۔

ایسا آدمی ہر قسم کے سطحی اور منفی جذبات سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے سینہ میں دوسرے آدمیوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب اپنے کسی بھائی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو اس کا سلامتی کا جذبہ "السلام علیکم" کی صورت میں اس کے منھ سے نکل پڑتا ہے۔ اس طرح وہ پہلے ہی قدم پر اپنا تعارف اس حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ اس کی بھلائی چاہنے والا ہے، وہ اس کی برائی چاہنے والا نہیں ہے۔

جب گفتگو ہوتی ہے تو وہ نرمی اور شرافت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ نہ چیختا اور نہ سخت آواز میں بولتا۔ وہ اپنی زبان سے صرف سچی بات نکالتا ہے، جھوٹی بات نہیں نکالتا۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ اس کے دل میں کچھ ہو اور اپنی زبان سے کچھ کہے۔ وہ کسی سے ایسا وعدہ نہیں کرتا جس کو پورا کرنے کے لئے اس کے دل میں پکا ارادہ نہ ہو۔ کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہو تب بھی وہ بیہودہ انداز اختیار نہیں کرتا۔ کوئی چھوٹا ہو تو وہ اس کے ساتھ حقارت کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ کسی کے ساتھ اس نے احسان کیا ہو تو وہ اس کو طعنہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے چھوٹوں کے لئے ہمدرد ہوتا ہے اور جو اس سے بڑے ہیں ان سے ادب کے ساتھ پیش آتا ہے۔

مومن کے دل میں خدا کا ڈر سمایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو اس سے روکتی ہے کہ وہ کسی کو ستائے اور کسی کے ساتھ بے انصافی کرے۔ وہ ہر ایک کو اس کا حق دیتا ہے وہ سخت احتیاط کرتا ہے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے۔ اس کا وجود کسی دوسرے کے اوپر بوجھ بن جائے۔ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور اگر وہ مدد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا دل اس کے لئے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ اپنے عمل سے کسی کو نہ دے سکے تو وہ اپنے دل اور اپنی زبان سے اس کو وہ بہترین چیز دیتا ہے جو وہ اسے دے سکتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں سمجھے، جو یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کو اپنے ہر قول و فعل کا جواب خدا کو دینا ہے۔ جو کمزور کے معاملہ میں شریر نہ بنے کیونکہ ہر کمزور کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ جو طاقت ور سے مرعوب نہ ہو، کیونکہ بالآخر ہر ایک خدا کے آگے بے طاقت ہو جانے والا ہے۔

زندگی کا امتحان

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جھک جائے۔ مگر شیطان آدم کے آگے نہیں جھکا۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ) پھر میں کمتر کے آگے کیوں جھکوں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا کردار فرشتوں کا تھا جو حکم ہوتے ہی فوراً آدم کے سامنے جھک گیے۔

آدم کی پیدائش کے وقت مذکورہ واقعہ کا پیش آنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ یہی معرکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آئے گا۔ اس طرح تخلیق انسانی کے آغاز ہی میں یہ بتادیا گیا کہ تمہارا اصل امتحان کہاں ہونے والا ہے۔ انسان کو موجودہ دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس کی بڑائی کا بت ٹوٹے پھر بھی وہ اس کو گوارا کرے۔ دوسرے کے مقابلے میں اس کو چھوٹا مقام ملے پھر بھی وہ اس پر راضی ہو جائے۔ اس کے احساس برتری کو کچلا جائے پھر بھی وہ حق وانصاف کے راستے سے نہ ہٹے۔ اس کی عظمت کا قلعہ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈھایا جائے پھر بھی وہ اس کا استقبال کرے۔

زندگی ایک ایسا امتحان ہے جس میں بار بار آدم کی مذکورہ کہانی دہرائی جاتی ہے یہاں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی بڑائی ٹوٹتی ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص کے مقابلہ میں کم تر مقام پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اب جو لوگ ایسے مواقع پر اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی ہو جائیں وہ فرشتوں کے ہم نشیں قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی بڑائی کا بت ٹوٹنا برداشت نہ کریں اور اس "آدم" کے آگے جھکنے پر راضی نہ ہوں جس کو اللہ نے ان کے مقابلے میں بڑائی دی تھی وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ ان کے لیے آخرت میں وہی انجام مقدر ہے جو ان کے پیش رو ابلیس کا ہونے والا ہے۔

زندگی ایک ایسا معرکہ ہے جس میں جیتے جی اپنے کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ جس میں خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر بنا کر اس میں لیٹ جانا پڑتا ہے۔ زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان ہے۔ جو لوگ اس ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے پر راضی ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ان باغوں میں جگہ پائیں گے جو ہر قسم کی ناخوشگواریوں سے پاک ہو، جہاں دوبارہ کچھ بھی برداشت نہ کرنا پڑے۔ جہاں انسان کو ہمیشہ کے لیے آزادی اور خوشی کی لامحدود دنیا حاصل ہو جائے۔

شیر دیکھ رہا ہے

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۹۰۷ میں ہندستان آیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ کمایوں (یوپی) کے جنگلوں میں بہت سے مردم خور شیر ہیں، وہ اپنی رائفل لے کر کمایوں کے جنگل میں پہونچ گیا۔ ۱۹۰۷ میں اس نے پہلے مردم خور شیر کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا جو ۴۳۰ آدمیوں کو مار کر کھا چکا تھا۔

جم کاربٹ نے کمایوں کے جنگلوں میں ۲۲ سال گزارے۔ اس نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ایک درجن سے زیادہ مردم خور شیروں کو ہلاک کیا۔ اس جان جوکھم کام کا واحد انعام، جم کاربٹ کی یہ روحانی تسکین تھی کہ وہ زمین کے ایک چھوٹے سے حصہ کو اس قابل بنائے کہ ایک لڑکی محفوظ طور پر وہاں چل سکے:

Satisfaction at having made a small portion of the earth safe for a girl to walk on.

جم کاربٹ نے اپنی کتاب کمایوں کے مردم خور شیر (Man-eaters of Kumaon) میں اپنے ان تجربات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو مردم خور شیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے پیش آئے۔ ایک موقع پر اس نے لکھا ہے کہ دن کی روشنی میں بھی شیر کی قربت، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ اس نے آپ کو دیکھا نہ ہو، خون کی گردش میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ پھر جب شیر ایک عام شیر نہ ہو، بلکہ وہ مردم خور شیر ہو، تاریک رات کے ۱۰ بجے ہوں، اور آپ جانتے ہوں کہ مردم خور شیر آپ کو دیکھ رہا ہے، اس وقت خون کی گردش ایک طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہے:

The near proximity of a tiger in daylight, even when it has not seen you, causes a disturbance in the bloodstream. When the tiger is not an ordinary one, however, but a man-eater and the time is ten o'clock on a dark night, and you know the man-eater is watching you, the disturbance in the blood becomes a storm.

یہ احساس کہ شیر میرے قریب ہے اور وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، آدمی کے خون میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔ پھر اس انسان کا کیا حال ہوگا جس کے اندر یہ یقین آجائے کہ وہ خدا جو تمام شیروں کا اور تمام زمین و آسمان کا خالق ہے، وہ میرے قریب ہے اور مجھ کو اس طرح دیکھ رہا ہے کہ میری کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

رفتار روک

گاڑی تیزی سے سڑک پر چلی جارہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے رفتار بہت کم کر دی۔ اس کے بعد ایک ہلکا سا جھٹکا ہوا اور پھر گاڑی اپنی رفتار سے چلنے لگی۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا تو سڑک کے کنارے ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا رفتار روک (Speed Breaker)

سڑک کے حادثے زیادہ تر گاڑی تیز دوڑانے سے ہوتے ہیں چنانچہ سڑکوں پر جگہ جگہ اونچا سامینڈ کی مانند بنادیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو رفتار گھٹانے پر مجبور کیا جاسکے۔ اسی بنا پر اس کو اسپیڈ بریکر (رفتار توڑنے والا) کہا جاتا ہے۔

یہ سڑک کے سفر کو محفوظ بنانے کا طریقہ ہے۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ زندگی کے سفر کو محفوظ بنانے کے لئے بھی اسپیڈ بریکر ہوں۔ آدمی اپنے کو آزاد سمجھ کر بے لگام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کو صاحب اختیار پا کر سرکشی کرنے لگتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ اس کو کوئی روکنے والا نہیں اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں اور جس طرح چاہوں رہوں۔ ایسی حالت میں اگر رکاوٹیں نہ ہوں تو آدمی بالکل بے قید ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی کی زندگی میں اسپیڈ بریکر رکھے جائیں۔ زندگی کے سفر میں اس پر جگہ جگہ روک لگائی جائے۔

اسلام کے احکام ایک اعتبار سے گویا زندگی کے لئے اسپیڈ بریکر ہیں۔ وہ آدمی کو بار بار روکتے ہیں تاکہ وہ اپنے معاملات میں حد سے باہر نہ جانے پائے —— آدمی دنیا کے کام میں مشغول ہے کہ اچانک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لئے چلو۔ آدمی اپنے مال کو صرف اپنا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ حکم آجاتا ہے کہ اس میں سے ایک حصہ دوسروں کے لئے نکالو۔ آدمی کھا رہا ہے اور پی رہا ہے کہ رمضان آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دو۔ آدمی اپنے عزیز و اقارب کے درمیان ہوتا ہے کہ حکم آتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر حج کے لئے چلے جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب گویا زندگی کے لئے ایک قسم کے اسپیڈ بریکر ہیں۔ یہ انسان کی رفتار کو بار بار کم کرتے ہیں تاکہ وہ حد کے اندر رہے، تاکہ وہ انصاف اور احتیاط کے ساتھ زندگی گزارے۔ تاکہ وہ ہر مرحلہ میں اعتدال کی زندگی پر قائم رہے۔

دو قسم کے لوگ

جسم کے اوپر کیچڑ لگ جائے تو اس کو پانی سے دھویا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جسم کے اندر کوئی داخلی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کو دھو کر صاف کرنا ممکن نہیں۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اگر آدمی اوپری طور پر کسی دینی خرابی میں مبتلا ہو تو اس کے متعلق امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے گا۔ مگر جن کے گناہوں نے جسم سے لے کر روح تک ان کا احاطہ کر لیا ہو، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی نہیں۔

ایک برائی وہ ہے کہ جب آدمی اس کو کرے تو اس کا دل اس کا ساتھ نہ دے۔ اس کو یہ احساس ستاتا رہے کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ اپنے اس فعل کی بنا پر اس کو خود اپنے آپ سے نفرت ہو جائے۔ وہ شرمندہ ہو کر معافی چاہے اور شیطان سے پناہ مانگتا ہوا اللہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسے آدمی کی اندرونی حالت اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کا گناہ اوپری گناہ تھا۔ وہ اس کی روح کا گناہ نہ تھا۔ اس کی برائی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے جسم کا اندرونی نظام تو صحت مند تھا۔ البتہ اس کے جسم کے اوپر کسی وجہ سے گندگی لگ گئی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے تزکیہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو پاک فرمائے گا۔ اور آخرت میں ان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ جنت کی پاکیزہ دنیا میں آباد ہو سکیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی برائی ان کے اندر تک داخل ہو گئی ہو۔ ان کے اعضاء جو کچھ کریں وہ ان کے دل و دماغ کا سوچا سمجھا منصوبہ ہو۔ ان کا فعل محض وقتی جذبہ کے تحت صادر نہ ہوا ہو بلکہ اس کے پیچھے حسد، بغض، کبر، انتقام، اور سرکشی جیسے اندرونی جذبات کام کر رہے ہوں۔ ان کے ظاہری عمل میں ان کے اندرونی احساسات پوری طرح شریک ہوں۔ ایسے لوگوں کی خرابی اوپری خرابی نہیں، وہ ان کی شخصیت میں آخری گہرائی تک اتری ہوئی ہے۔ اس قسم کے لوگ تزکیۂ خداوندی سے محروم رہیں گے، وہ آخرت میں جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔

پہلی قسم کے لوگ دنیا ہی میں اپنا حساب آپ کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کے حساب سے بچ جائیں گے۔ دوسری قسم کے لوگ دنیا میں اپنے حساب سے غافل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں پکڑے جائیں گے۔ اور جو شخص آخرت میں پکڑا جائے اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

شیطان کا حملہ

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر سے شیطان کا مکالمہ ہوا۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، اس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے :

قَالَ النبیُّ وَاِنیّ وَاللّٰہِ مَا اَحْسَسْتُ بِكَ قَطُّ الاّ استعذتُ باللّٰہ منك۔ قال عدوُّ اللّٰہ صَدقتَ بھٰذ اتنجُومِنیّ فَقَالَ النبیُّ اَخْبِرْنِی بایّ شیٔ تغلب ابن آدم قال آخذہ عند الغضب والھوی۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۵۵)

(شیطان نے کہا کہ تم کس طرح مجھ سے نجات پاؤ گے) پیغمبر نے کہا کہ خدا کی قسم جب بھی میں نے تیری طرف سے کچھ محسوس کیا تو میں نے تجھ سے اللہ کی پناہ مانگی۔ دشمنِ خدا نے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ اسی کے ذریعہ تم مجھ سے نجات پا سکتے ہو۔ پھر پیغمبر نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم کس چیز کے ذریعہ دوبارہ انسان کے اوپر غلبہ حاصل کرو گے۔ شیطان نے کہا کہ غصہ اور خواہش کے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب غصہ میں ہوتا ہے یا جس وقت اس پر کسی خواہش کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ شیطان کے لیے غیر محفوظ (Vulnerable) بن جاتا ہے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے اندر ایک ایسی کمزوری پیدا کر دیتا ہے جہاں سے شیطان آدمی کے اندر داخل ہو جائے اور اس کو اپنا شکار بنالے، وہ اس کو جنت کے رُخ سے ہٹا کر جہنم کے رخ پر چلانے لگے۔

آدمی کو سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرنا چاہیے وہ خود اس کا اپنا غصہ اور اس کی خواہش پرستی ہے۔ اس خطرہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ جب بھی آدمی اپنے اندر اس قسم کے احساسات پائے وہ اس کو شیطان کا حملہ سمجھے اور فوراً شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑکتا ہے تو وہ شیطان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ جب اس پر کوئی خواہش غالب آتی ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ شیطان اس کو اپنے قابو میں کرلے گا۔ ایسے ہر موقع پر گناہ اور بے انصافی سے بچنے کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی اللہ کی مدد مانگے، وہ شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ میں آجائے۔

جنّت کا دروازہ

امام ابن تیمیہ کا قول ہے: دنیا میں بھی ایک جنت ہے، جو شخص دنیا کی جنت کا ذائقہ نہیں چکھے گا وہ آخرت کی جنت میں نہیں جا سکتا (ان فی الدنیا جنۃ من لم یذقہا لم یدخل جنۃ الآخرۃ) دنیا کی جنت یہ ہے کہ وہ اعمال جو آدمی کو آخرت کی جنت میں لے جانے والے ہیں وہ اس کے لئے محبوب بن جائیں۔ جنت میں داخلہ جس طرح آدمی کے لئے انتہائی پسندیدہ ہوگا اسی طرح جنت والے اعمال میں اس کو لذت اور اطمینان حاصل ہونے لگے۔

دنیا کی جنت یہ ہے کہ آدمی دنیا کے دکھائی دینے والے سہاروں سے زیادہ خدا کے نہ دکھائی دینے والے سہارے پر بھروسہ کرنے لگے۔ دنیا کی محبتوں سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو اور دنیا کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ رسول کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسند ہو خواہ وہ اس کے خلاف کیوں نہ جاتا ہو۔ وہ دنیا کی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے۔ حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے۔ بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگانے سے بڑھ کر تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لئے آنسو بہا رہا ہو۔ وقار کا سوال اگر سچی بات کو قبول کرنے میں مانع ہو تو اپنے وقار کو مجروح کر کے وہ سچائی کا طریقہ اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔

جب اس کو کسی سے شکایت ہو تو انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہو۔ حقوق کو غصب کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ جب اس کے سینہ میں حسد اور بغض اور گھمنڈ کے جذبات بھڑکیں تو ان کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کو کچل ڈالنا اس کو زیادہ مرغوب ہو۔ کسی کے خلاف بری رائے قائم کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔

جنت میں جینا یہ ہے کہ آدمی جنتی اعمال میں جی رہا ہو۔ وہ صبر و شکر کا طریقہ اپنائے ہوئے ہو۔ اس کو عجز و تواضع میں لذت ملتی ہو۔ وہ نمائشی کاموں کے بجائے خاموش کاموں میں رغبت رکھتا ہو۔ وہ اپنی آنکھ اور اپنی زبان پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہو۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ جنتی اعمال میں اپنے لئے کشش پاتا ہو وہ گویا جنت کی فضاؤں میں جی رہا ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کے برعکس اعمال اس کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہوں وہ گویا جہنم میں اپنے صبح و شام بسر کر رہا ہے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم جب کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی شخص محض اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقائق سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دیئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اس کو ملتی ہے جس کے دل میں سچائی کی کھٹک موجود ہو۔ جو شخص سچائی کی تلاش میں ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو، جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو، جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب ہو، قرآن اسی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سُن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص مادی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے عالم حقائق سے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

نبوّت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب قرآن کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے۔ اب قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

قال اللہ

ایمان بالغیب

قرآن کتابِ ہدایت ہے۔ مگر قرآن سے ہدایت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو غیب کے اوپر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں (ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب، البقرہ)

اللہ تعالیٰ نے دو دنیائیں بنائیں۔ ایک دنیائے شہود، اور دوسری دنیائے غیب۔ آخرت کی دنیا شہود کی دنیا ہے۔ وہاں تمام چیزیں ظہور کی حالت میں ہیں۔ وہاں تمام حقیقتیں اپنی برہنہ صورت میں نظر آتی ہیں۔ آخرت میں ہر آدمی سچائی کو ماننے پر مجبور ہوگا، وہاں کسی کے لیے منکر بننا ممکن نہیں۔

مگر موجودہ دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں تمام حقیقتیں غیب کی حالت میں رکھی گئی ہیں۔ یہی آدمی کا امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو ان حقیقتوں کو عقل کی آنکھ سے دیکھنا ہے جن کو وہ آخرت میں سر کی آنکھ سے دیکھے گا۔ آخرت کی مشہود نعمتیں انھیں لوگوں کے لیے ہیں جنھوں نے موجودہ غیب کی دنیا میں ان پر یقین لانے کا ثبوت دیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سارا امتحان اسی بات کا ہے کہ کون حالتِ غیب میں مومن بنتا ہے اور کون حالتِ شہود میں۔ جو لوگ اس وقت ایمان لائیں جب کہ حقائق ظاہر ہو چکے ہوں گے، ان کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ اللہ کے نزدیک مومن صرف وہ ہے جس نے غیب کا پردہ پھٹنے سے پہلے غیب کی باتوں کو مان لیا ہو۔ جس نے سچائی کو اس کے مجرّد روپ میں دیکھ لیا ہو۔

جو شخص خدا کی نعمتوں میں اپنا حصہ پانا چاہتا ہے، اس کو خدا پر اس وقت یقین کرنا ہے جب کہ ابھی وہ غیب میں ہے۔ اس کو اس آخرت کے لیے جینا ہے جس کو اس نے دیکھا نہیں۔ اس کو خدا کی ان نعمتوں کا اعتراف کرنا ہے جس میں اس کو حصہ نہیں دیا گیا۔ اس کو ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جس کا فائدہ موجودہ زندگی میں نہیں ملتا۔ اس کو ان داعیانِ حق کا ساتھ دینا ہے جن کے داعئ حق ہونے کی گواہی دینے کے لیے ابھی فرشتے ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کو ایک ایسی چیز کو اپنی منزل بنا کر سفر کرنا ہے جو موجودہ دنیا میں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔

غیر مومن دکھائی دینے والی دنیا میں جیتا ہے اور مومن نہ دکھائی دینے والی دنیا میں۔ یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک کا انجام دوزخ بن جاتا ہے اور دوسرے کا انجام جنّت۔

عبادتِ الٰہی

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم دوزخ کے عذاب سے بچ جاؤ (البقرہ ۲۱) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶)

عبادت کا مطلب انتہائی خضوع اور عاجزی ہے۔ اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو ایک انتہائی طاقتور کے مقابلہ میں انتہائی عاجز کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ خدا ہر قسم کی طاقتوں کا خزانہ ہے۔ اسی نے انسان کو وجود بخشا ہے۔ جو کچھ انسان کو حاصل ہے وہ سب کا سب خدا کا عطیہ ہے۔ خدا اوّل سے آخر تک انسان کے اوپر کامل اختیار رکھتا ہے۔ ایسے خدا پر یقین سے آدمی کے اندر جو کیفیت ابھرتی ہے، اسی کا نام عبادت ہے۔

عبادت کی یہ کیفیت ابتداءً آدمی کے دل و دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کی روح کو ہلا دیتی ہے۔ اور جب انسان کی اندرونی ہستی کا یہ حال ہوتا ہے تو اس کا خارجی وجود بھی اس کی اسی اندرونی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے۔ آدمی ہمہ تن اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اسی ڈال دینے کی ایک متعین صورت کا نام نماز ہے۔

جب آدمی کا دل عبادت کے احساس سے سرشار ہوتا ہے اور اس کا جسم عبادت گزار جسم بن جاتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کی روزمرّہ کی زندگی میں عبادت گزاری کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ جذبہ اسے مجبور کرتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جب اس کے تعلقات پیش آئیں، اور لوگوں سے جب اس کا لین دین ہو تو ان معاملات میں بھی وہ عبادت گزارانہ روش پر قائم رہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک بندۂ عاجز کا سلوک ہو نہ کہ بندۂ سرکش کا سلوک۔

ایک شخص جب خدا کی خدائی کا اعتراف کر کے اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کا بندہ بن جائے تو اس کی ساری زندگی میں عبادت گزاری کی روح شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا سوچنا، اس کا بولنا، اس کا چلنا، غرض اس کی ہر کارروائی عابدانہ رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

مسجد کے اندر اس کا کردار رکوع اور سجدہ کا کردار ہوتا ہے اور مسجد کے باہر اس کا کردار تواضع اور اعتراف کا کردار۔ ایک اعتبار سے وہ عبادت گزار انسان ہوتا ہے اور دوسرے اعتبار سے ذمہ دار انسان۔

تقویٰ کیا ہے

قرآن میں تقویٰ کی بہت زیادہ اہمیت بتائی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہدایت اسی شخص کو ملتی ہے جس کے اندر تقویٰ ہو۔ تمام عبادات کا خلاصہ تقویٰ کو بتایا گیا ہے۔ جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ والی روح لے کر اپنے رب کے پاس پہنچیں۔ تقویٰ ایمان و اسلام کا حاصل ہے۔

تقویٰ کا مطلب اللہ سے ڈرنا ہے۔ انسان جب خدا کے وجود کو دریافت کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا ہر قسم کے عظمت و جلال کا مالک ہے۔ وہی دینے والا اور وہی چھیننے والا ہے۔ ایسے خدا کا تصور آدمی کے اندر جو زلزلہ خیز کیفیت پیدا کرتا ہے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی نے اپنے رب کو پا لیا۔

جس آدمی کے اندر تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو جائے، وہ خدا کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ اس کو ہر روز اور ہر موقع پر خدا کی یاد آتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کی نظر میں خدا سب سے بڑی ہستی ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ہر لمحہ اس کے اندر ایک نہ دکھائی دینے والا طوفان برپا کرتا رہتا ہے۔ ایسا آدمی ہر وقت خدا کے احساس میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔

تقویٰ کی کیفیت آدمی کے دل کو ایک اندیشہ ناک دل بنا دیتی ہے، وہ آخری حد تک ایک ذمہ دار انسان بن جاتا ہے۔ خدا کی پکڑ کا خوف اس کو اس طرح بے قرار کر دیتا ہے کہ کسی حال میں وہ بے حس یا غافل بن کر نہ رہ سکے۔ کسی حال میں بھی وہ خدا کو نہ بھولے۔

تقویٰ کی نفسیات جس آدمی کے اندر پیدا ہو جائے وہ اپنا نگراں آپ بن جاتا ہے۔ وہ اپنا احتساب خود کرنے لگتا ہے، اس کا یہ یقین کہ موت کے بعد اس کو مالک کائنات کے سامنے حاضر ہونا ہے، اس کو مستقل طور پر چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ دنیا ہی میں اپنے آپ کو خدا کی عدالت میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے، وہ قیامت سے پہلے قیامت کا تجربہ کر لیتا ہے۔

جو آدمی تقویٰ والا آدمی ہو، وہ اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دیکھے بغیر خدا سے ڈرا، اس نے حساب کیے جانے سے پہلے اپنا حساب کیا۔ یہ صفت خدا کو اتنا زیادہ پسند ہے کہ جو آدمی اس صفت کا ثبوت دے، اس کے لیے خدا یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس کو ابدی نعمتوں کے باغ میں داخل کر دو جہاں اس کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

دو روحیں

فَأَلهَمَها فُجورَها وَتَقواها۔ قَد أَفلَحَ مَن زَكّاها۔ وَقَد خابَ مَن دَسّاها۔ (الشمس)

اللہ نے ہر نفس کو سمجھ دی، اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔ وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا، اور وہ شخص نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ہر آدمی پر موت آتی ہے اور یہاں سے اٹھا کر وہ آخرت کے ابدی ٹھکانے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس امتحان کی نوعیت یہ ہے کہ ہر آدمی کے لیے بیک وقت دو امکانات کھول دیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی روح کو وہ پاکیزہ روح بنائے جو جنّت میں بسائے جانے کے قابل ہو، پھر اس کو جنّت کی اعلیٰ اور نفیس دنیا میں یہ کہہ کر داخل کر دیا جائے کہ تم اس میں بسو اور ابدی راحتوں میں رہنے کی خوشی حاصل کرو۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ آدمی اپنی فطرت کے ربانی تقاضوں کو دبا کر اپنی روح کو گندا کر لے۔ ایسا آدمی جنّت کے ماحول میں رہنے کے لیے نااہل ٹھہرے گا۔ اس کو جہنم کی پُر عذاب دنیا میں دھکیل دیا جائے گا۔

زندگی میں بار بار دونوں قسم کے مواقع آتے ہیں۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ کھلے دل سے اس کا اعتراف کر لے تو اس نے اپنی روح کو پاک کیا، اور اگر وہ جاننے کے بعد اس کو نظرانداز کرے تو اس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ اس کے لیے حق کی ادائیگی کا ایک موقع پیش آتا ہے۔ اگر وہ حق کو اس کے حق دار کے حوالے کر دے تو اس نے اپنی روح کو پاک کیا، اور اگر وہ سرکشی کرے اور حق کو اس کے حق دار کے حوالے نہ کرے تو اس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ اس کی تحویل میں کچھ اسباب و ذرائع دیے جاتے ہیں۔ اب اگر وہ ان اسباب و ذرائع کو خدائی تقاضوں کے مطابق استعمال کرے تو اس نے اپنی روح کو پاک کیا، اور اگر اس نے ان اسباب و ذرائع کو اپنی ذات کے تقاضوں کی تکمیل میں لگا دیا تو اس نے اپنی روح کو گندا کر لیا۔

اسی طرح آدمی کے سامنے روزانہ وہ حالات آتے ہیں جب کہ اس کے لیے یہ موقع ہوتا ہے کہ یا تو ایک روش اختیار کر کے جنتی انسان بنے، یا دوسری روش اختیار کر کے جہنمی انسان بن جائے۔ جس شخص نے اپنے آپ کو جیسا بنایا ہے، اسی کے مطابق انجام اس کو آخرت میں ملے گا۔

برف کی مانند

سورہ العصر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گزرتے ہوئے زمانہ کی قسم، بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے ——— (والعصر ان الانسان لفی خسر) اس کی تفسیر کرتے ہوئے امام الرازی نے لکھا ہے :

عن بعض السلف، فهمت معنى السورة من بائع الثلج - كان يصيح و يقول : ارحموا من يذوب رأس ماله، ارحموا من يذوب رأس ماله - فقلت هذا معنى ان الانسان لفي خسر يمرُّ به العصر فيمضي عمره ولا يكتسب فاذا هو خاسر -

بعض سلف سے منقول ہے کہ میں نے سورہ عصر کا مفہوم ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو آواز لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اس آدمی پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے۔ اس آدمی پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا یہ ہے مطلب انسان کے گھاٹے میں رہنے کا۔ آدمی پر زمانہ گزرتا ہے، اسی کے ساتھ اس کی عمر بھی گزر رہی ہے۔ اب جو شخص کسب نہیں کرتا وہ گھاٹے میں ہے۔

برف ایک ایسا اثاثہ ہے جو ہر وقت پگھلتا رہتا ہے، وہ پگھل پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برف کے دکان دار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ برف کے پگھلنے سے پہلے اس کو بیچ ڈالے اور اپنے اثاثہ کو رقم کی صورت میں تبدیل کر لے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو بالآخر اس کا برف ختم ہو جائے گا اور اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ برف کے دکان دار کو کامیابی تو اپنی کوششوں سے حاصل ہوگی۔ مگر ناکامی کے لیے اس کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ناکامی تو اپنے آپ اس کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔

یہی معاملہ انسان کی زندگی کا بھی ہے۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ وہ ہر روز گھٹتی رہتی ہے۔ آج اگر آپ کی عمر کے سو دن باقی تھے تو کل ۹۹ دن باقی رہیں گے۔ پرسوں ۹۸ دن، نرسوں ۹۷ دن۔ اس طرح کم ہوتے ہوتے سارے دن ختم ہو جائیں گے۔ ایسی حالت میں کامیاب وہ ہے جو مستعدی دکھائے اور اپنی عمر کو وقت پورا ہونے سے پہلے استعمال کر لے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو عمر کی مدت گھٹتے گھٹتے ایک روز ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ اس حال میں اس دنیا سے چلا جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔

جو آدمی اپنی عمر سے عمل صالح نہ کمائے وہ برباد ہو گیا۔ وہ اس برف کی مانند ہے جو پگھلتا رہا اور پگھلتے پگھلتے ایک دن ختم ہو گیا۔

سب سے بڑی خبر

قرآن کی سورہ نمبر ۷۸، میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ کس چیز کے بارہ میں پوچھ رہے ہیں، اُس بڑی خبر (النبأ العظیم) کے بارہ میں جس میں لوگ مختلف ہیں (النبا ۱-۲) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک ایک خبر ایسی ہے جو سب سے بڑی خبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اس کے متعلق جانے۔ وہ خبر اس قابل ہے کہ اس کے بارہ میں لوگوں کو سب سے زیادہ آگاہ کیا جائے۔

یہ سب سے بڑی خبر کیا ہے۔ مذکورہ سورت میں اس کو تنبیہہ و تہدید کے خدائی اسلوب میں بتایا گیا ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ انسان کے اوپر ایک یوم الفصل (فیصلہ کا دن) آنے والا ہے۔ جب اس کا مقررہ وقت آئے گا تو خدا کے حکم سے فرشتہ صور پھونکے گا۔ یہ اس بات کا آخری اعلان ہو گا کہ امتحان کی مدت ختم ہو گئی، اب سزا و جزا کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام اگلے اور پچھلے انسان خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا ابدی جنّت میں داخل کیا جائے گا یا ابدی جہنم میں۔

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو بے شمار نعمتوں کے درمیان پاتا ہے۔ وہ ایک بہترین جسم اور اعلیٰ صلاحیت والا دماغ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ دنیا میں آتا ہے تو یہاں اس کو ایک ایسی زمین تیار حالت میں ملتی ہے جہاں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں بہترین صورت میں مہیا ہیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔

انسان کے لیے یہ اعلیٰ کائناتی انتظام اس لیے کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ وہ دنیا میں اس طرح زندگی گزارے کہ وہ اپنے رب کا عبادت گزار اور شکر گزار بندہ بنا ہوا ہو۔

جو شخص تواضع اور شکر گزاری کی زندگی گزارے، وہ آزمائش میں پورا اترا۔ اس کو موجودہ تمام نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ ابدی طور پر دے دی جائیں گی۔ اور جو لوگ سرکشی اور بے اعترافی کا طریقہ اختیار کریں، وہ آزمائش میں ناکام ہو گئے۔ ان سے تمام نعمتیں چھین لی جائیں گی۔ اس کے بعد ان کو دوزخ کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا تاکہ ابدی طور پر حسرت اور عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔

یہ بلاشبہہ تمام خبروں میں سب سے زیادہ بڑی خبر ہے۔

عظیم رسوائی

قرآن میں قیامت کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ ـــــــــــ جس دن حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا اور لوگ سجدہ کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ اور وہ سجدہ کے لیے بلائے جاتے تھے (مگر وہ سجدہ نہیں کرتے تھے) حالانکہ وہ صحیح سالم تھے۔ پس چھوڑ دو مجھ کو اور ان کو جو اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں، ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں جہاں سے وہ نہیں جانتے (القلم ۴۲-۴۴)

قیامت جب غیب کے پردہ کو پھاڑے گی تو اللہ اپنے عظمت و جلال کے ساتھ سامنے آجائے گا، اس وقت جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائیں گے وہ نجات پائیں گے اور جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے نہیں جھکیں گے وہ عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

قیامت میں اللہ کے سامنے صرف وہ لوگ جھک سکیں گے جو دنیا میں سچائی کے آگے جھکے ہوں۔ دنیا میں سچائی کا ظاہر ہونا اللہ کی بات کا ظاہر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح بالواسطہ انداز میں دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہے اور کون اس کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں۔ بالواسطہ امتحان میں جو لوگ پورے اتریں وہی براہِ راست امتحان میں کامیاب ہوں گے۔

سب سے بڑی نیکی اعتراف ہے، اور موجودہ دنیا میں اسی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا براہ راست طور پر انسان کے سامنے نہیں ہے۔ مگر انسان کو اس نے ایسی عقل اور سمجھ دے دی ہے جس سے وہ غیب کو جانے، جس سے وہ نہ دکھائی دینے والے خدا کو دیکھ لے۔

دنیا میں خدا نے کائنات کی صورت میں اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ وہ سچائی کے ظہور کی صورت میں اپنی بات کا اعلان کرتا ہے۔ ان مواقع پر آدمی کو معرفت کا ثبوت دینا ہے، اس کو نشانِ حق میں خدا کو دیکھنا ہے اور کلامِ حق میں خدا کو سننا ہے۔

دنیا میں جب ایک شخص سچائی کا اعتراف نہیں کرتا تو وہ اپنے آپ کو سخت ترین خطرے میں ڈالتا ہے۔ یہ سادہ معنوں میں صرف ایک سچائی کو رد کرنا نہیں بلکہ خود خدا کو رد کرنا ہے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھکنے کی توفیق نہیں پائیں گے۔ اور بلاشبہ اس سے بڑی اور کوئی رسوائی نہیں کہ رب ذوالجلال ظاہر ہو کر سامنے آئے اور آدمی اس کے آگے جھک کر اس کی خدائی کا اعتراف کرنے سے عاجز ہو جائے۔

دو راستے

فاما من اعطی واتقی۔ وصدق بالحسنی۔ فسنیسرہ للیسری۔ واما من بخل واستغنی۔ وکذب بالحسنی۔ فسنیسرہ للعسری (اللیل ۶-۱۰)

پس جس نے دیا، اور وہ ڈرا، اور اس نے بھلائی کو سچ مانا، تو اس کو ہم آسان راستہ کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا، اور بے پروا رہا، اور بھلائی کو جھٹلایا، تو اس کو ہم سخت راستہ کے لیے سہولت دیں گے۔

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین بنیادی خصوصیات ہیں جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔ اسی طرح دوسری تین خصوصیات ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ تین پسندیدہ خصوصیات یہ ہیں :

انسان کے مقابلہ میں دینے والا بننا۔
خدا کے مقابلہ میں ڈرنے والا بننا۔
حق کے مقابلہ میں اعتراف کرنے والا بننا۔

دوسری تین خصوصیات وہ ہیں جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ وہ تین خصوصیات یہ ہیں :

انسان کے مقابلہ میں روکنے والا ہونا۔
خدا کے مقابلہ سرکشی کرنے والا ہونا۔
حق کے مقابلہ میں نہ ماننے والا ہونا۔

پہلی تین خصوصیات آدمی کے اندر مومنانہ نفسیات پیدا کرتی ہیں۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے خدا کے راستہ پر چلنا آسان ہو جائے۔ اس کا سابقہ جب کسی انسان سے پیش آتا ہے تو اس کے لیے وہ خیر خواہ اور نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ جب خدا کا کوئی حکم اس کے سامنے آتا ہے تو اس کا احساس بندگی اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوراً اس کی تعمیل میں لگ جائے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق پیش کیا جاتا ہے تو وہ کھلے دل کے ساتھ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ اسی طرح زندگی کے راستوں پر چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے برعکس دوسری تین خصوصیات آدمی کے اندر غیر مومنانہ نفسیات پیدا کرتی ہیں۔ ایسے انسان کا مزاج ہمیشہ اس کو بدی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ تواضع کے بجائے سرکشی، حق رسانی کے بجائے حق تلفی، انصاف کے بجائے ظلم اور اعتراف کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اسی طرح چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

نفس مطمئن

اللہ کے سچے بندے پر جب موت آتی ہے، اور وہ دنیا کی زندگی سے نکل کر آخرت کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو خدا کے فرشتے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہتے ہیں : اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنّت میں (الفجر)

حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کا ذائقہ اس شخص کو ملتا ہے جو اللہ کو رب بنانے پر اور محمدؐ کو پیغمبر ماننے پر اور اسلام کو دین کی حیثیت سے اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا حدیث کی کتابوں میں آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :

اللّٰهم انّی اسألك نفسا بك مطمئنة تؤمن بلقائك وترضى بقضائك وتقنع بعطائك	اے اللہ، میں تجھ سے ایک ایسا نفس مانگتا ہوں جو تجھ پر مطمئن ہو، تیری ملاقات پر ایمان رکھتا ہو، تیرے فیصلہ پر راضی ہو اور تیرے دیے پر قانع ہو۔

مذکورہ آیت میں نفس مطمئن (النفس المطمئنة) سے مراد وہ انسان ہے جو دنیا میں اس طرح رہا کہ وہ دوسرے معبودوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کو معبود بنانے پر راضی تھا، خواہ اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جائے۔ وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کو پکڑے رہا، خواہ اس کی وجہ سے وہ اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن گیا ہو۔ اس نے خدا کے بے آمیز دین کو اختیار کیا، خواہ اس کی بنا پر لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہونے کی نوبت آ جائے۔ اس کو اس کے رب نے جو کچھ دیا اس پر اس نے شکر کیا، اور جو کچھ اس کو نہیں ملا، اس پر اس نے صبر کیا۔

یہی وہ انسان ہے جو اللہ کا مطلوب بندہ ہے، اور یہی وہ انسان ہے جو موت کے بعد خدا کی اس جنّت میں داخل ہو گا جہاں نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوف۔

موجودہ دنیا میں اس بات کا امتحان ہے کہ آدمی خدا کے فیصلہ پر راضی ہے یا نہیں۔ خدا اپنی حکمت کے تحت موجودہ دنیا میں کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ یہاں امتحان میں پورا اترنا یہ ہے کہ آدمی خدا کے دیے پر راضی رہے۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ خدا کی پسند پر راضی رہیں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اپنی پسند کی زندگی سے سرفراز کیے جائیں گے۔

ذکر و دعا

اسلامی عمل بظاہر بہت سی چیزوں کا نام ہے۔ کوئی عمل عبادت سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی اخلاق سے۔ کسی کا تعلق معاملات سے ہے اور کسی کا تعلق جہاد اور مقابلہ سے۔ مگر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اسلامی عمل صرف ایک ہے، اور وہ ذکر و دعا ہے۔ قرآن و حدیث میں جن اعمال کا حکم دیا گیا ہے، ان کا مقصود یہ ہے کہ ان اعمال کے ذریعہ آدمی کے اندر وہ نفسیاتی استعداد پیدا ہو جب کہ اس کے اندر ذکر و دعا کی کیفیت ابھرنے لگے جو اصلاً اللہ کو مطلوب ہے۔

آدمی جب نماز ادا کرتا ہے تو گویا وہ اپنے اندر اس نفسیاتی حالت کو پیدا کرتا ہے کہ وہ کہہ سکے کہ خدایا، میرے پاس عجز تھا، میں نے تجھ کو اپنا عجز پیش کر دیا۔ تیرے پاس قدرت ہے، تو اپنی قدرت سے مجھے وہ چیز دے دے جس کا میں محتاج ہوں۔

جب آدمی زکوٰۃ دیتا ہے تو وہ اپنے اندر یہ نفسیاتی حالت پیدا کرتا ہے کہ وہ کہہ سکے کہ خدایا، میرے پاس جو اثاثہ تھا وہ میں نے تیری راہ میں دے دیا، اب تیرے پاس جو خزانہ ہے اس میں تو مجھے حصہ دار بنا دے۔ اسی طرح آدمی جب روزہ رکھتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو یہ کہنے کے قابل بناتا ہے کہ خدایا، میں تیرے لیے بھوکا رہا، اب تو مجھ کو اپنے اتھاہ رزق سے سیراب کر دے۔

آدمی جب حج کے لیے سفر کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں وہ حالات پیدا کرتا ہے جو اس کی زبان سے ان الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوں کہ خدایا، میں تیری طرف چلا، مگر میں اپنے کمزور قدموں سے تیرے پاس پہنچ نہیں سکتا۔ تو اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اٹھا لے۔

یہی معاملہ تمام اسلامی اعمال کا ہے۔ حتیٰ کہ آدمی جب کسی سے شکایت پیدا ہونے کے باوجود اس کو معاف کر دیتا ہے تو وہ اپنے اندر یہ کہنے کی زہن پیدا کرتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے بندوں سے درگزر کیا، تو بھی مجھ کو معاف کر دے اور میری غلطیوں سے درگزر فرما۔

وہی عمل اسلامی عمل ہے جو انسان کو اس کے رب سے جوڑنے کا ذریعہ بن جائے۔ جو آدمی کی روح میں لطافت پیدا کر کے اس کو خدا سے قریب کر دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کے سینہ سے ذکر و دعا کا سیلاب امنڈنے لگے۔

ایک کردار

وَاتلُ عَلَیھِم نَبَأَ الَّذِیٓ اٰتَینٰہُ اٰیٰتِنَا فَانسَلَخَ مِنھَا فَاَتبَعَہُ الشَّیطٰنُ فَکَانَ مِنَ الغٰوِینَ۔ وَلَو شِئنَا لَرَفَعنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخلَدَ اِلَی الاَرضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الکَلبِ اِن تَحمِل عَلَیہِ یَلھَث اَو تَترُکہُ یَلھَث۔ ذٰلِکَ مَثَلُ القَومِ الَّذِینَ کَذَّبُوا بِاٰیٰتِنَا فَاقصُصِ القَصَصَ لَعَلَّھُم یَتَفَکَّرُونَ

(الاعراف ۷۶-۱۷۵)

اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان کو چھوڑ کر نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کی بدولت اس کا رتبہ بلند کر دیتے۔ مگر وہ زمین کا ہو رہا اور اس نے اپنی خواہش کی پیروی کی۔ تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، تم اس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم ان احوال کو بیان کرو شاید کہ وہ غور کریں۔

اللہ تعالیٰ ایک شخص کے لیے ایسے حالات برپا کرتا ہے کہ وہ حق کا اعتراف کرے اور پھر اعترافِ حق کا انعام پائے مگر اس کی خودی اس کے لیے اعتراف کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے مواقع کھولتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں استعمال کرے اور خدا کے دین کا خادم بنے مگر وہ اپنی سطحی خواہشات سے ایسا مغلوب ہوتا ہے کہ ان مواقع کو استعمال نہیں کر پاتا۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے دروازے کھولتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کرے اور نیک اعمال کر کے خدا کی رحمت و مغفرت کا مستحق بنے، مگر اپنے جھوٹے تقاضوں کی اہمیت اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ وہ اس دروازہ میں داخل نہیں ہوتا یا داخل ہوتا ہے تو اپنی نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے جلد ہی اس سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی عقل پر ان کی خواہشات نے غلبہ پالیا۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔ وہ دروازہ کھولے جانے سے پہلے بھی محروم تھے اور دروازہ کھولے جانے کے بعد بھی وہ محروم رہے۔

قال الرسول

ایمان

قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو نجران سے آئے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا کچھ حصہ سنا۔ ان پر کھل گیا کہ یہ دین برحق ہے وہ اسی وقت ایمان لائے اور روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے: واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تریٰ اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشاھدین (المائدہ ۸۳)

اس آیت میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق) یعنی حق کو پہچان لینا۔ جس چیز کی پہچان ہو اسی کے لحاظ سے آدمی کے اندر تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا چوں کہ سب سے بڑی طاقت ہے اس لیے خدا کی پہچان سے آدمی کے اندر عجز اور تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ نجران کے لوگوں میں جب خدا کی معرفت پیدا ہوئی۔ جب ان پر خدا کی عظمت منکشف ہوئی تو ان کا سینہ پھٹ گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من مات وھو یعلم انہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ (جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا)

اس حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ یعنی جاننا، آگاہ ہونا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک جاننے کا واقعہ ہے۔ وہ ایک شعوری دریافت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اسی قسم کا ایک گہرا تجربہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ڈسکوری (دریافت) کہا جاتا ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے۔ ایمان ایک ایسی ہستی کی موجودگی کو پالینا ہے جو بظاہر ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ایمان اس گہرے ادراک کا نام ہے جب کہ آدمی کے لیے غیب کا پردہ پھٹ جاتا ہے اور وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اسے دیکھنے لگتا ہے۔

مطلوب بندے

عن ابی ایوب الانصاری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل لرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیالٍ یلتقیان فیعرض ھذا ویعرض ھذا وخیرھما الذی یبدأ بالسلام (متفق علیہ)

حضرت ابوایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن تک چھوڑے رکھے۔ دونوں کا سامنا ہو تو یہ ادھر منہ پھیرلے اور وہ اُدھر منہ پھیرلے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جنھیں نمایاں ہونے کا کوئی شوق نہ تھا۔ وہ گم نامی میں جیے اور گم نام ہی اس دنیا سے چلے گیے۔ جنھوں نے جو کچھ کیا صرف اللہ کے لیے کیا، ان کی کوئی اور غرض اس میں شامل نہ تھی، جو اتنا بے نفس تھے کہ اگر کسی بھائی سے بگاڑ کی بات ہو گئی تو انھوں نے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے پہل کی۔

اس دنیا میں بگاڑ کا پیش آنا فطری ہے۔ مگر بگاڑ پر قائم رہنا سرکشی ہے۔ جو شخص بگاڑ پر قائم رہے، وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ خود پرستی کا مریض ہے۔ وہ اپنی ذات کو حق سے بلند سمجھتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کو وہ مقام دے رہا ہے جو مقام خدا کو دیا جانا چاہیے۔ حق کا مجروح ہونا اسے گوارا ہے، مگر اپنی ذات کا مجروح ہونا اسے گوارا نہیں۔

ایسے ہی لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کسی سے کوئی شکایت کی بات ہو جاتی ہے تو وہ غصہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس سے سلام وکلام بند کر دیتے ہیں۔ حتی کہ جب جذبات ٹھنڈے پڑتے ہیں اور انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اس وقت بھی وہ دوبارہ تعلقات پیدا کرنے میں پہل نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنے لیے سُبکی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے پہل کی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔

اس قسم کے خیالات یقیناً شیطانی وسوسہ ہیں۔ اور مومن کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے وسوسوں سے بچے۔ وہ اللہ کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دے۔

اسلامی عبادات

قالَ حُذَیفۃُ انا سمعتُہ یقولُ : فتنۃُ الرجلِ فی أھلہِ و مالہِ و جارِہ یُکَفِّرُھا الصلاۃُ والصیامُ والصَّدَقَۃُ (بخاری کتاب الصوم) ۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آدمی اپنے گھر میں اور اپنے مال میں اور اپنے پڑوسی کے ساتھ جو غلطیاں کرتا ہے، نماز اور روزہ اور صدقہ اس کا کفارہ بن جاتے ہیں ۔

موجودہ دنیا میں آدمی مختلف تعلقات کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ طرح طرح کے معاملات پڑتے ہیں۔ یہ سب چیزیں انسان کے لیے آزمائش ہیں۔ اس آزمائش میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سے کوتاہیاں اور غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ مگر اسلام کی عبادت کا نظام ان کوتاہیوں کو اسی طرح دھو دیتا ہے جس طرح آدمی کے جسم پر میل لگ جائے اور غسل کرنے کے بعد اس کا جسم دوبارہ پاک صاف ہو جائے ۔

آدمی نے کسی کے ساتھ سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ اس کے بعد جب وہ مسجد میں جاتا ہے اور اللہ کے آگے سجدہ کرتا ہے تو اس کو یاد آجاتا ہے کہ میں تو ایک عاجز بندہ ہوں، میرے لیے سرکشی کا رویہ درست نہیں۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سرکشی کا رویہ چھوڑ دے ۔

اسی طرح روزہ میں بھوک پیاس کا تجربہ آدمی کے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ اللہ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں وہ کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اس نے اگر اس سے پہلے بے اعترافی اور احسان فراموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا تو اب وہ اعتراف اور احسان مندی کے طریقہ کو اختیار کر لیتا ہے ۔

اسی طرح آدمی جب صدقہ اور زکوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو وہ اس مومنانہ احساس کا تجربہ کرتا ہے کہ اس کو دوسروں کا خیر خواہ ہونا چاہیے ۔ اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن کر رہے۔ یہ تجربہ اس کو اس قابل بناتا ہے کہ اگر اب تک وہ دوسروں کا بدخواہ تھا تو اب وہ ان کے ساتھ خیر خواہی کرے، اگر اس سے دوسروں کو نقصان پہنچ رہا تھا تو اب وہ سوچنے لگتا ہے کہ میں اپنے رویہ کو بدلوں اور دوسروں کے لیے مفید بن کر زندگی گزاروں ۔

اسلام کی عبادتیں ایک قسم کا روحانی غسل ہیں جو بار بار آدمی کو دھو کر اس کو پاک کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو جنتی انسان بنا دیتی ہے ۔

مومنانہ صفات

عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اِتّقِ اللہَ حَیثُما کنتَ واَتبِعِ السیئۃَ الحسنۃَ تَمحُھا وخالِقِ الناسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (رواہ الترمذی)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم جہاں بھی ہو، اللہ سے ڈرو۔ اور برائی کے بعد بھلائی کرو، وہ برائی کو مٹا دے گی۔ اور لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہو۔

اس حدیث رسول میں تین بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں ـــــــ یہ تین باتیں گویا پورے دین اسلام کا مغز اور خلاصہ ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اللہ کی موجودگی کا احساس آدمی کے اوپر اتنا زیادہ چھا جائے کہ وہ ہر جگہ اس کو حاضر و ناظر سمجھنے لگے۔ وہ خواہ جہاں ہو اور جس مشغولیت میں بھی ہو، وہ اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھے اور اس سے ڈرتے ہوئے اپنا ہر کام کرنے لگے۔

دوسری بات برائی کے بدلے میں بھلائی کرنا ہے۔ یہی برائی کو ختم کرنے کا سب سے زیادہ یقینی طریقہ ہے۔ اگر برائی کے جواب میں برائی کی جائے تو برائی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ مگر جب آپ برائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی والا سلوک کرتے ہیں تو آپ پہلے ہی مرحلہ میں برائی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

اسلام آدمی کے اندر اعتراف اور تواضع کا مزاج بناتا ہے۔ ایسا آدمی لوگوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ وہ ہر وقت حق کو ماننے کے لیے تیار رہتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ تعلقات کے دوران دوسروں کو اس سے نرمی اور بےنفسی کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے حق میں اچھے سلوک والا انسان بن جاتا ہے۔

آدمی کا معاملہ ایک طرف خدا سے ہے۔ دوسری طرف اس کا معاملہ اپنے جیسے انسانوں سے ہے۔ خدا تمام انسانوں کا خالق و مالک ہے۔ اس لیے خدا کے معاملہ میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی اس کی عظمت کے احساس سے سرشار ہو۔ وہ اس کے غضب سے ڈرے اور اس کی رحمتوں کا امیدوار ہو۔

انسان کے معاملہ میں آدمی سے جو چیز مطلوب ہے وہ اچھا اخلاق ہے۔ اگر بالفرض کسی انسان کے ساتھ برائی ہو جائے تو فوراً اس کے ساتھ بھلائی کر کے اس کی تلافی کرنا چاہیے۔

آگ سے بچاؤ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من استطاع ان یقی وجھہ من النار ولو بشقۃ من تمر فلیفعل. ومن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ فان بہا تجزی الحسنۃ عشر امثالہا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے چہرہ کو آگ سے بچاسکے تو اس کو چاہئے کہ وہ ایسا کرے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص یہ بھی نہ پائے تو وہ ایک پاکیزہ بول کے ذریعہ اپنے آپ کو آگ سے بچائے۔ کیوں کہ انسان کے عمل کا خدا کے یہاں دس گنا بدلہ دیا جاتا ہے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کھجور کا ٹکڑا یا پاکیزہ بول بذات خود جہنم کی آگ سے بچنے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ خدا کے یہاں جو قیمت ہے وہ دراصل اس بے قراری کی ہے جس کے تحت مذکورہ قسم کے اعمال کسی بندہ خدا سے صادر ہوتے ہیں۔

خدا انسان کی اس بے قراری کو دیکھنا چاہتا ہے جب کہ وہ جہنم کے عذاب کو سوچ کر تڑپ اٹھے اور اس سے بچنے کے لئے جو کچھ اس کے بس میں ہے اسے کر ڈالے۔ آدمی کے سامنے ایک ضرورت مند آتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے۔ آدمی کو اس کی بے بسی دیکھ کر آخرت میں اپنی بے بسی یاد آجاتی ہے۔ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ اپنی جیب کے چند پیسے یہ کہتے ہوئے سائل کو دے دیتا ہے کہ خدایا میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو اسی حقیر انفاق کو میرے لئے قبول کرلے اور مجھ کو آخرت کے عذاب سے نجات دے دے۔

اسی طرح ایک اور شخص ہے جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو وہ اپنے بھائی کو دے۔ مگر جب بھی موقع آتا ہے وہ دوسرے کے حق میں خیر خواہی کا کلمہ بولتا ہے۔ اس کی زبان سے نہ گھمنڈ کے الفاظ نکلتے اور نہ حسد کے الفاظ۔ اس کا کلام اللہ کے ڈر سے نہایا ہوا ہوتا ہے۔ ہر موقع پر وہ وہی کہتا ہے جو عدل وانصاف کا تقاضا ہو۔ ایسا انسان بھی دوسروں کو کچھ دے رہا ہے۔ اس سے اس کے بھائیوں کو بہتر جذبات مل رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے شر سے بچائے ہوئے ہے۔ ایسا شخص بھی ان لوگوں میں ہے جس کے لئے آخرت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

تین چیزیں

عن ابی هریرة رضی الله عنه، ان رسول الله صلّی الله علیه وسلّم قال: ثلاث منجیات وثلاث مهلکات: فالمنجیات، فتقوی الله فی السر والعلانیة والقول بالحق فی الرضا والغضب والقصد فی الفقر والغنی۔ واما المهلکات: فهوی متبع، وشح مطاع واعجاب المرء بنفسه وهی اشدهن۔ (رواه البیهقی)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں۔ چھپے اور کھلے ہر حال میں اللہ سے ڈرنا۔ خوشی اور ناراضگی دونوں حالت میں حق بات کہنا۔ محتاجی اور دولت مندی دونوں میں اعتدال پر قائم رہنا۔ اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنا۔ حرص کی پیروی۔ آدمی کا اپنے آپ کو اونچا سمجھنا اور یہ آخری چیز سب سے زیادہ سخت ہے۔

چھ چیزیں جو اس حدیث میں بتائی گئی ہیں یہ دراصل ایمان کی پہچان ہیں۔ جس آدمی کو خدا کی گہری معرفت حاصل ہوجائے اس کا حال یہ ہوجائے گا کہ اس کو ہر وقت یہ محسوس ہوگا کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

ایسے آدمی کے لئے کھلی اور چھپی دونوں حالتیں برابر ہوجاتی ہیں۔ وہ خوش ہو جب بھی ایک حد کے اندر رہتا ہے اور ناخوش ہو تب بھی اس کی زبان پر خوف خدا کی لگام لگی رہتی ہے۔ محتاجی اور دولت مندی دونوں اس کے لئے یکساں ہوجاتی ہیں۔ کیوں کہ خدا کی نسبت سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

ایسے آدمی کے اوپر یہ یقین چھا جاتا ہے کہ آخرکار اسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ یہ احساس اس سے یہ آزادی چھین لیتا ہے کہ وہ خواہشات کے پیچھے دوڑے۔ وہ حرص کی بندگی میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو اونچا سمجھنا اس کے لئے ایسا ہی ہوجاتا ہے جیسے کوئی چیونٹی پہاڑ کے نیچے رینگ رہی ہو اور اپنی بڑائی کے فخر میں مبتلا ہو۔ خدا کو پانا دراصل اس حقیقت کو پانا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو شخص خدا کو سب سے بڑے کی حیثیت سے پالے اس کے اندر اپنی بڑائی کا احساس کہاں باقی رہے گا۔

نعمت پر شکر

عن ابی ھریرۃ ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - انظروا الی من ھو اسفلُ منکم ولا تنظروا الی من ھو فوقکم - فھو اجدر أن لا تزدروا نعمۃ اللہ علیکم (رواہ مسلم)	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے، اس کو نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے۔ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔

موجودہ دنیا میں کسی کو جو چیز ملتی ہے وہ آزمائش کے لیے ملتی ہے۔ آزمائش کی مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ نے کسی کو کم دیا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو چھوٹا درجہ ملا ہے اور کسی کو بڑا درجہ۔ اب اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ اپنا مقابلہ اپنے سے اوپر والے شخص سے کرے تو وہ اپنے انعامات کو کم سمجھے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر اپنے رب کے لیے شکایت کا جذبہ ابھرے گا نہ کہ شکر کا جذبہ۔ حالانکہ خدا کو اپنے بندوں سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ شکر ہی ہے۔

اپنے آپ کو اس عظیم محرومی سے بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اپنا مقابلہ ہمیشہ اس شخص سے کرے جس کو اس سے کم دیا گیا ہے۔ کوئی شخص صحت میں اس سے کم ہے، کوئی ذہانت میں اس سے کم ہے، کوئی دنیوی سازو سامان میں اس سے کم ہے۔ آدمی جب اپنا مقابلہ ایسے لوگوں سے کرے گا تو اس کے اندر اپنے رب کے لیے شکر کا جذبہ امنڈے گا۔ وہ اپنے اوپر خدائی انعامات کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کے سامنے سجدہ میں گر جائے گا۔

شکر سب سے بڑی نیکی ہے۔ اس نیکی کو حقیقی طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ذہن کی حفاظت کرے۔ وہ اپنی سوچ کو ناشکری کے رخ پر جانے سے بچائے۔ وہ اپنے ذہن کو ہمیشہ اس رخ پر چلائے جس کے نتیجہ میں اس کے اندر شکر کے احساسات ابلنے والے ہوں۔ جو آدمی اس طرح اپنی حفاظت نہیں کرے گا وہ اپنے رب کو عین وہی تحفۂ عبدیت پیش کرنے سے عاجز رہے گا جو اس کو سب سے زیادہ اپنے رب کے سامنے پیش کرنا تھا۔

اللہ کی نعمت پر شکر کرنا فرض ہے، مگر اللہ کی نعمت پر وہی آدمی شکر کر سکے گا جو ملی ہوئی نعمت کی قدر دانی کرنا جانتا ہو۔

ایمان وعمل

عن ابی العالیۃ قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرون انہ لایضر مع لاالٰہ الا اللہ ذنب کما لاینفع مع الشرک عمل فنزلت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم) فخافوا ان یبطل الذنب العمل
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۱۸۱)

حضرت ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یہ خیال کرتے تھے کہ لاالٰہ الا اللہ کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہ پہونچائے گا جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں پہونچاتا۔ اس پر یہ آیت اتری: اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو (محمد ۳۳) اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ گناہ عمل کو باطل کر دیتا ہے۔

ایمان ایک قسم کا معاہدہ ہے۔ بندہ جب ایمان کے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا ہے تو وہ اللہ سے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ ایک اللہ کو اپنا بڑا جانے گا۔ وہ اپنے قول وعمل میں صرف اس طریقہ کی پیروی کرے گا جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ بتایا ہے۔

اب اگر ایسا ہو کہ ایک شخص معاہدہ کے الفاظ تو بول دے مگر اپنے حقیقی رویہ میں وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا معاہدہ اللہ کی نظر میں باطل ہو جائے گا۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچا سکے گا۔

وہی ایمان قابل اعتبار ایمان ہے جو آدمی کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ آدمی بولے تو وہی بولے جو ایمان کے مطابق اسے بولنا چاہیے۔ آدمی کرے تو وہی کرے جو ایمان کے مطابق اسے کرنا چاہیے اس کا ایمان اس کی زندگی کے اوپر حاکم بن جائے۔

دنیا کا ہر معاہدہ اپنے عمل کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ اور عمل میں مطابقت ہے تو معاہدہ برقرار رہتا ہے۔ ورنہ معاہدہ توڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے معاہدہ کو بھی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا۔ اگر آدمی کا عمل اس کے ایمان کے مطابق ہے تو اللہ اس کے معاہدۂ ایمان کو قبول کرے گا۔ ورنہ وہ اس کو رد کر دے گا۔ ایسا ایمان اللہ کے یہاں بے قیمت قرار پائے گا جس کے ساتھ عمل شامل نہ ہو۔

غصّہ نہیں

عن ابی ھریرۃ ، انّ رجلاً قال للنبیّ صلی اللہ علیہ وسلم اوصِنی - قال لاتغضب - فردّد مراراً - قال لاتغضب -
(رواہ البخاری)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کر۔ اس نے بار بار پوچھا۔ آپ نے ہر بار فرمایا کہ غصہ نہ کر۔

ایک آدمی جب دوسروں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے تو بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب اس کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس کی انا کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس کو دوسروں کے قول یا عمل کے بارہ میں شکایت ہو جاتی ہے۔ اس کو دوسروں کی طرف سے تلخ تجربہ پیش آتا ہے۔

ایسے مواقع پر ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی غصہ ہو جائے۔ وہ نفرت اور انتقام کے جذبات کے تحت لوگوں سے معاملہ کرنے لگے۔ یہ منفی ردعمل کا طریقہ ہے، اور منفی ردعمل سے اسلام میں منع کیا گیا ہے۔ منفی ردعمل کسی بھی حال میں پسندیدہ نہیں۔

غصہ کسی کو اس وقت آتا ہے جب کہ اس کو غصہ دلایا جائے۔ اس لیے حدیث کا پورا مطلب یہ ہوگا کہ تم کو غصہ دلایا جائے تب بھی تم غصہ نہ ہو۔ تمہارے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے تب بھی تم اپنے آپ کو جوابی اشتعال سے بچاؤ۔

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ غصہ دلانے والا فعل کیا جائے تب بھی آدمی غصہ نہ کرے۔ تلخ تجربات کی بنا پر اس کے دل کو جھٹکا لگے تو وہ اس کو اپنے سینہ کے اندر برداشت کرے، وہ اس کو دوسرے کی طرف نہ لوٹائے۔ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ غصہ کو اپنے اوپر سہے۔ وہ اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر کا ثبوت دے۔

غصہ نہ کرنے والا اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ عظیم ترین اسلامی عمل انجام دے۔ وہ برائی کا جواب بھلائی سے دے۔ وہ تکلیف پہنچانے والے کے حق میں نیک دعائیں کرے۔ وہ دشمنی کرنے والے سے دوست جیسا سلوک کرے۔ وہ نفرت کرنے والے کو محبت کا تحفہ پیش کرے۔ وہ اپنے بدخواہوں کے ساتھ خیرخواہی کا معاملہ کر کے اپنے انسانی درجہ کو بلند کر لے۔

جنّت بھی اور جہنّم بھی

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان العبد لیتکلم بالکلمۃ من رضوان اللّٰہ لا یلقی لھا بالا یرفع اللّٰہ بھا درجات وان العبد لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللّٰہ لا یلقی لھا بالا یھوی بھا فی النار ابعد ما بین المشرق والمغرب ۔
(متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ اللہ کی رضا میں ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجے بہت بڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ ایسی آگ میں ڈال دیا جاتا ہے جس کا فاصلہ مشرق و مغرب سے زیادہ ہو۔

وہ کون سی بات ہے جو کہنے میں تو بظاہر صرف ایک معمولی بات ہوتی ہے مگر اخروی نتیجہ کے اعتبار سے وہ اتنی سنگین ہوتی ہے کہ آدمی کو یا تو جنت میں پہنچا دیتی ہے یا جہنم میں۔ یہ بات وہ ہے جب کہ آدمی صرف اللہ کی خاطر ایک شخص کے بارہ میں حق کا کلمہ کہے۔ یا اللہ سے بےخوف ہونے کی وجہ سے کسی کے بارہ میں ناحق بات بولے۔

زندگی میں بار بار ایسے نازک مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کی زبان سے نکلا ہوا جملہ دوسرے شخص کے لئے نہایت اہم بن جاتا ہے۔ کبھی ایک جملہ کسی کی واقعی حیثیت کا اعتراف کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کی حیثیت پر پردہ ڈالنے والا۔ کبھی ایک جملہ دوسرے کی عزت کو بچانے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کو بےعزت کر دینے والا۔ کبھی ایک جملہ حسد میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور کبھی ایک جملہ خیر خواہی میں نہایا ہوا۔

ایسے مواقع پر خدا سے ڈرنے والا آدمی اپنے منھ سے وہ ذمہ دارانہ لفظ نکالے گا جو خدا کو خوش کرنے والا ہو اور اس بنا پر وہ خدا کی جنت کا مستحق بن جائے گا۔ اور جو شخص خدا سے بےخوف ہے وہ ایسے غیر ذمہ دارانہ الفاظ بولے گا جس میں اس کا اپنا نفس لذت پا رہا ہو اور اس کی وجہ سے وہ جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

علم کا صدقہ

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم:	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے
افضل الصدقۃ أن یتعلم المرءُ المسلمُ	اچھا صدقہ یہ ہے کہ مسلمان ایک علم سیکھے پھر اس کو
علماً ثم یعلّمہ اخاہ المسلم	اپنے مسلمان بھائی کو سکھائے۔

(رواہ احمد عن ابی ہریرہ)

صدقہ کیا ہے۔ صدقہ دراصل اس خیرخواہی کا نام ہے جو ایک بھائی کی طرف سے اپنے دوسرے بھائی کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ اس خیرخواہی کا اظہار کبھی مال کی صورت میں ہوتا ہے۔ کبھی ایک اچھی نصیحت کی صورت میں اور کبھی کسی دوسری صورت میں۔ خیرخواہی انسان کے سینہ میں جاری ہونے والا ربانی چشمہ ہے اور صدقۂ علم اس ربانی چشمہ کی خارجی سیرابی۔

علم (سچائی کی معرفت) بلاشبہہ اس کائنات کی سب سے بڑی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علم سب سے بڑا صدقہ ہے۔ آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں یہ سب سے زیادہ انوکھا واقعہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے شخص کی بھلائی کے لئے تڑپے اور اس کو سچائی کا وہ نور پہنچائے جو اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔

دوسرے کو علم دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دوسرے کا خیرخواہ بن جائے۔ اس کے لئے آدمی کو دوسرے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کو پانے والا بنانے کے لئے اپنے آپ کو نہ پانے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اپنی بات کو دوسرے کی نظر میں قابل قبول بنانے کے لئے اپنے آپ کو دوسرے کے مقام پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسرے کے درمیان سننے اور سنانے کی فضا بنانے کی خاطر یک طرفہ طور پر ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دینا پڑتا ہے جو دونوں کے درمیان معتدل فضا کو برہم کئے ہوئے ہوں۔

علم کا صدقہ سب سے بڑی قربانی کی قیمت پر دیا جاتا ہے۔ یہ دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو خالی دیکھنے پر راضی ہو جائے۔ اس دنیا میں دینے والا بننے کے لئے کھونے والا بننا پڑتا ہے۔ چوں کہ لوگ کھونے والا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس لئے وہ دینے والے بھی نہیں بنتے۔

آدابِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ قرآن کو کھولتے ہیں تو سب سے پہلا لفظ جو پڑھنے کے لیے ملتا ہے، وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ یعنی میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ یہ کلمہ ہر کام کو شروع کرتے ہوئے پڑھا جائے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کُلُّ امرٍ لا یُبدأ فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو اجذم (ہر کام جس کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ بے اصل ہے)

یہ کلمہ آدمی کو یاد دلاتا ہے کہ تم جس دنیا میں اپنا کام کرنے جا رہے ہو وہ ایک ایسے خدا کی دنیا ہے جو رحمت اور مہربانی کی حد تک انسان کا مددگار ہے۔ اس لیے اس خدا کو یاد کرو اور اس خدا سے مدد طلب کرتے ہوئے اپنا کام شروع کرو۔

ایک شخص جب خدا کو پالے تو وہ خدا کی عظمتوں میں جینے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں ساری حیثیت خدا کو حاصل ہے۔ اس کو جو کچھ ملے گا، خدا سے ملے گا۔ اور اگر خدا نہ دے تو اسے کچھ ملنے والا نہیں۔ کام شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا اسی مومنانہ احساس کا اظہار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا گویا خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔ یہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کو یاد کرنا ہے۔ یہ خدا کے بارہ میں اپنے اس یقین کو دہرانا ہے کہ وہ قادر مطلق بھی ہے اور رحمان و رحیم بھی، اس لیے وہ اپنے بندہ کی ضرور مدد فرمائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے بغیر کام شروع کرنا اپنی ذاتی بنیاد پر کام شروع کرنا ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کام شروع کرنا خدا کی بنیاد پر کام شروع کرنا۔ خدا کی دنیا میں اپنی بنیاد پر کام شروع کرنا حقیقت فراموشی ہے، اور خدا کی دنیا میں خدا کی بنیاد پر کام شروع کرنا حقیقت پسندی۔ پہلا شخص ایک بھٹکا ہوا آدمی ہے، اس کے لیے منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔ دوسرا شخص صحیح راستہ کا مسافر ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنی منزل پر پہونچ جائے گا۔

خدا کا نام کائنات میں عظیم ترین حقیقت کے طور پر لکھا ہوا ہے۔ انسان جب اس غیر ملفوظ کلام کو پڑھ کر اس کو ملفوظ صورت میں کہہ اٹھے تو یہی وہ عمل ہے جس کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا گیا ہے۔

حمد اللہ کے لیے

قرآن کی پہلی سورہ کا پہلا جملہ ہے الحمد للہ ربّ العالمین (تمام شکر اور تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے عالم کا رب ہے) حمد ایک اعتبار سے خلاصۂ قرآن اور خلاصۂ دین ہے۔ دین کو پوری طرح پالینے کے بعد ایک مومن کا احساس جس کلمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، وہی حمد کا کلمہ ہے۔

انسان کا وجود اس کے حق میں خدا کی ایک نعمت ہے۔ انسان کا انتہائی موزوں جسم خدا کی نعمت ہے۔ پوری دنیا خدا کی نعمت ہے جو انسان کے لیے بے حد موافق انداز میں بنائی گئی ہے آدمی پر جب یہ حقیقت کھلتی ہے اور وہ خدا کی بے پایاں نعمتوں کا احساس کرتا ہے تو اس کی روح شکرِ خداوندی کے جذبہ سے بھر جاتی ہے۔ اس کا دل و دماغ خدا کی عظمتوں کے ادراک سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے بے اختیارانہ طور پر اپنے خالق و مالک کے لیے اعتراف کا کلمہ نکل پڑتا ہے۔ الحمد للہ ربّ العالمین یہی کلمۂ اعتراف ہے۔

خداوند ذو الجلال اس سے زیادہ بلند ہے کہ انسان اسے کوئی چیز دے سکے۔ واحد چیز جو کوئی انسان اپنے رب کے حضور میں پیش کر سکتا ہے وہ صرف اعتراف ہے۔ سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی کی روح خدا کے عظمت وجلال کے احساس سے بھر جائے۔ وہ اپنی عبدیت کے مقابلہ میں خدا کی ربوبیت کو پہچانے۔ وہ اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کے کمالات کا اقرار کرے۔ وہ اپنی بے مائگی کے مقابلہ میں خدا کے احسانات کو ماننے والا بن جائے۔

جب آدمی خدا کو اس کی ان صفاتِ کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کی روح اس کے آگے بچھ جاتی ہے۔ اس کی پوری ہستی خدا کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ خدا کے احسانات کا احساس اس کے اندر سمندر کی طرح ابل پڑتا ہے۔ یہ کیفیت جب الفاظ کی صورت میں ڈھلتی ہے تو اسی کا نام حمد اور شکر ہے۔

خدا تمام کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔ کائنات ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ مگر خدا کی عظیم تر بڑائی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس چھپی ہوئی بڑائی کو پالینے کا نام معرفت ہے اور معرفت کے اس احساس کا لفظوں میں ڈھل جانا الحمد للہ ربّ العالمین ہے۔

انشاءاللہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ بھائیوں کا ایک باغ تھا۔ باغ کے پھل تیار ہوئے تو انھوں نے کہا کہ کل ہم ضرور اپنے باغ کا پھل توڑیں گے۔ لیکن اگلے دن صبح کو وہ باغ میں پہونچے تو ایک خدائی آفت باغ کی پوری فصل کو تباہ کر چکی تھی۔ ان کی اس محرومی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے جب باغ کا پھل توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے ساتھ انشاءاللہ نہ کہا۔ (القلم ۱۸)

انشاءاللہ (اگر اللہ نے چاہا) ایک عظیم مومنانہ کلمہ ہے۔ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آدمی جب بھی کوئی کام کرنا چاہے تو اس کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے وہ انشاءاللہ کے الفاظ بھی ضرور اپنی زبان سے ادا کرے۔ یہ کلمہ گویا اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں اصل کارساز اللہ ہے۔ وہی تمام کام بنانے والا ہے۔ اس دنیا میں میری چاہ صرف اس وقت پوری ہوگی جب کہ اللہ کی چاہ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ انشاءاللہ کہنا اپنے چاہنے میں اللہ کے چاہنے کو ملانا ہے، یہ اپنے ارادے کے ساتھ اللہ کے ارادے کو شامل کر لینا ہے۔

اس دنیا میں تمام اختیارات صرف اللہ کو حاصل ہیں۔ وہ بے شمار چیزیں جن کو استعمال کرکے آدمی اپنا کام بناتا ہے، وہ سب کی سب اللہ کے حکم کے تحت عمل کرتی ہیں۔ انسان کے اختیار میں صرف چاہنا ہے، بقیہ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔

آدمی جب خدا کی اس قدرت کو اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو سوچتا ہے تو اس وقت اس کا احساس جن الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے وہ یہی انشاءاللہ کے الفاظ ہیں۔ اس طرح وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ میں صرف کوشش کا آغاز کر سکتا ہوں۔ مگر اس کو تکمیل تک پہونچانا مکمل طور پر خدا کے اختیار میں ہے، وہ میرے اختیار کی چیز نہیں۔

انشاءاللہ کا کلمہ حقیقت کے اعتبار سے ایک دعا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا کام شروع کرتے ہوئے اپنے رب سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ میرے ارادہ کو اپنی توفیق اور تائید سے پورا کر دے۔ انشاءاللہ کہنا گویا زندگی کے سفر میں مالکِ کائنات کو اپنے ساتھ لینا ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ خود مالکِ کائنات اس کا ہم سفر ہو جائے، اس کو منزل تک پہونچنے سے کون روک سکتا ہے۔

جزاک اللہ

اسلام کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو جب دوسرے شخص سے کوئی فائدہ پہونچے یا اس کو کوئی عطیہ ملے تو وہ دینے والے کے حق میں جزاک اللہ خیر الجزاء کا کلمہ کہے۔ یعنی اللہ تم کو بہترین بدلہ عطا کرے۔

یہ ایک اعلیٰ انسانی جذبہ ہے کہ آدمی کے ساتھ جب کوئی احسان کیا جائے تو وہ اس کے احسان کا اعتراف کرے۔ جب اس کو کسی سے فائدہ پہونچے تو وہ یہ اعلان کرے کہ یہ فائدہ اس کو فلاں شخص کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔

اس اعتراف کی سب سے بہتر اور کامل صورت اس کے لیے جزاک اللہ کا کلمہ کہنا ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ آدمی مزید یہ اعتراف کرتا ہے کہ بدلہ دینے کا حقیقی اختیار صرف خدا کو ہے۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ خدایا، تو اس کی مدد فرما جس طرح اس نے میری مدد کی، تو مزید اضافہ کے ساتھ اس کو وہ چیز عطا فرما جو اس نے مجھے عطا کی ہے۔

جزاک اللہ کا کلمہ انسانی آبادی میں بیک وقت دو قسم کی روح کو ابھارتا ہے اور اس کو زندہ رکھتا ہے۔ ایک، اعتراف کی روح۔ اور دوسرے، لینے کے ساتھ دینے کی روح۔

یہ دنیا اعتراف اور بے اعترافی کا امتحان ہے۔ یہاں بار بار ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ آدمی کے لیے یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ اعتراف کرکے اپنی انسانیت کو اونچا کرلے یا بے اعترافی کی روش اختیار کرکے پستی کے گڑھے میں جا گرے۔ جزاک اللہ کا کلمہ آدمی کے اندر اعتراف کی روح کو بیدار کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ کلمہ آدمی کے اندر یہ روح جگاتا ہے کہ وہ دوسروں سے لینے کے ساتھ دوسروں کو دینے والا بنے۔ جس سے اس کو نفع پہونچا ہے، اس کو وہ خود بھی نفع پہونچائے۔ دینے والے کے عطیہ کا اس کو اتنا زیادہ احساس ہو کہ اس کے حق میں اس کے دل سے بہترین دعائیں نکلنے لگیں۔

ایک حقیقی دعا سب سے بڑا عطیہ ہے جو کوئی شخص کسی کو دے سکتا ہے۔

السلام علیکم

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اے لوگو، تم لوگ آپس میں سلام کو پھیلاؤ (یا ایھا الناس افشوا السّلام علیکم) اسلام میں زندگی کے جو آداب بتائے گیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بھی دو آدمی کا سامنا ہو یا دو آدمی آپس میں ملاقات کریں تو ایک شخص کہے السّلام علیکم (تمہارے اوپر سلامتی ہو) اس کے بعد دوسرا شخص جواب میں کہے وعلیکم السّلام (تمہارے اوپر بھی سلامتی ہو)

سلام کا یہ کلمہ ایک قسم کی دعا ہے۔ ایک مومن دوسرے مومن کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ہر آن دوسرے انسانوں کے لیے نیک جذبہ موجود ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی تنہائیوں میں دوسرے انسانوں کے لیے نیک دعائیں کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے کسی شخص سے ملتا ہے تو اس کا یہ اندرونی جذبہ بے ساختہ طور پر اس کلمہ کی صورت میں نکل پڑتا ہے کہ السّلام علیکم (تمہارے اوپر سلامتی ہو، خدا تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازے)

السّلام علیکم اس عمومی زندگی کا ایک اظہار ہے جو ایک شخص کی اپنے سماج کے اندر ہونی چاہیے۔ اس دنیا میں ہر شخص کو اس طرح زندگی گزارنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا بھلا چاہنے والا ہو۔ وہ تمام انسانوں کو امن اور سلامتی کی حالت میں دیکھنا چاہتا ہو۔ ایک شخص جب دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ السّلام علیکم تو دوسرے سے گویا وہ اپنی اس حیثیت کا تعارف کراتا ہے کہ میں تمہارے لیے کیسا ہوں۔ میں تم کو سلامتی کی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری سلامتی کو گزند پہونچنا مجھے گوارا نہیں۔

السّلام علیکم کہہ کر آدمی اپنے آپ کو اس کا پابند بناتا ہے کہ دوسروں کو اس سے سلامتی کے سوا کسی اور سلوک کا تجربہ نہ ہو، اس کا وجود دوسروں کے لیے ہر حال میں سلامتی اور رحمت کا ذریعہ بنا رہے۔

السلام علیکم کہنا کوئی رسمی کلمہ دہرانا نہیں، وہ بااصول زندگی گزارنے کا ایک مقدس عہد ہے۔ السّلام علیکم کہنے والا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ وہ ہر حال میں "السّلام علیکم" کے کلمہ کے تابع ہوگا۔ وہ سلامتی اور خیرخواہی کا ہوگا نہ کہ بے امنی اور بدخواہی کا۔

سواری کے وقت

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر ہے کہ اُس نے انسان کے لیے کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر وہ سواری کرتا ہے اور ان پر بیٹھ کر بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تعلیم دی گئی ہے کہ تم جب ان سواریوں پر بیٹھو تو اللہ کے انعام کو یاد کرو اور اس طرح کہو: سُبحَانَ الّذِی سَخّرلَنَا ھٰذا وماکُنّا لَہٗ مُقرنِین، وَاِنّا اِلیٰ رَبّنا لمُنقلبُون (پاک ہے وہ جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا، اور ہم ایسے نہ تھے کہ ان کو قابو میں لاتے۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں) الزخرف ۱۳-۱۴

انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار انعامات ہیں ان میں سے ایک انعام وہ ہے جس کو سواری کہا جاتا ہے۔ انسان کو اپنی مختلف ضروریات کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ آدمی اپنے پیروں پر چل کر زیادہ دور تک نہیں پہونچ سکتا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مدد کی۔ اور کچھ چیزوں کو اس طرح مطیع بنا دیا کہ وہ انسان کے لیے سواری کا کام دے سکیں۔

ابتدائی طور پر انسان کے پاس گھوڑوں اور چوپایوں کا ذریعہ تھا۔ پھر انسان نے سمندر کے امکانات کو استعمال کیا اور بحری کشتیوں کے ذریعہ سفر کرنے لگا۔ مزید تحقیق کے بعد انسان نے جانا کہ اللہ تعالیٰ نے مادہ میں ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ اس کے لیے تیز رفتار سواری کی صورت میں ڈھل سکیں۔ اس طرح موٹر کار اور ہوائی جہاز جیسی مشینی سواریاں وجود میں آئیں۔ انسان برّی اور بحری سفروں سے آگے بڑھ کر فضائی بلندیوں میں تیز رفتار سفر کرنے لگا۔

گھوڑے سے لے کر ہوائی جہاز تک تمام سواریاں خدا کی نعمتیں ہیں۔ وہ خدائی تسخیر کی بنا پر ممکن ہوئی ہیں۔ وہ انسان کے اوپر براہ راست خدا کا عطیہ ہیں۔ آدمی جب چیزوں کی اس حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو وہ بے تابانہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا، تو ہی ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے لیے مسخر کر دیا، ورنہ ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اس طرح ہم ان کو اپنا خادم بنا سکیں۔

شکر کرنے والے کے لیے دنیا میں بھی نعمت ہے اور آخرت میں بھی نعمت۔ اور ناشکروں کے لیے دنیا میں وقتی نعمت ہے اور آخرت میں ابدی عذاب۔

اناللہ

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم ضرور انسانوں کو آزمائیں گے، ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ ایسی حالت میں جو لوگ صبر کریں ان کے لیے خوش خبری ہے۔ جن کا حال یہ ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پہونچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

موجودہ دنیا کو اللہ نے آزمائش کے لیے بنایا ہے۔ یہاں پانا اور کھونا دونوں آزمانے کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو کچھ ملے تو وہ شکر کا ثبوت دے۔ اور اگر وہ کھوئے تو وہ صبر کا رویہ اختیار کرے۔ جو شخص ایسا کرے وہی وہ شخص ہے جو آزمائش میں پورا اترا۔

اس دنیا میں لازماً ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ ناخوش گوار تجربے پیش آئیں گے۔ کبھی اس پر ڈر کے لمحات آئیں گے۔ کبھی وہ بھوک اور پیاس کی تکلیف سے دوچار ہوگا۔ کبھی ایسا ہوگا کہ جان و مال کی صورت میں اس کو جو کچھ حاصل ہے۔ اور اس کو جو فائدے مل رہے ہیں، ان میں سے کسی چیز کو وہ جزئی یا کلی طور پر کھودے گا۔ کبھی اس کے دوست یا عزیز کی موت واقع ہو جائے گی۔ ان تمام مواقع پر اس کی زبان سے جو کلمہ نکلنا چاہیے وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا کلمہ ہے۔

اس کلمہ کے ذریعہ آدمی خدا کے مقابلہ میں اپنی عبدیت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدایا، دینے والا تو ہی تھا۔ اگر تو نے اپنے دیئے ہیں سے کسی چیز کو لے لیا تو تجھ کو حق تھا کہ تو اس چیز کو مجھ سے لے لے۔

اِنَّا لِلّٰہ کہنا ایک عبادتی عمل ہے۔ یہ کلمۂ شکایت کے حالات میں کلمۂ اعتراف پیش کرنا ہے۔ یہ بے صبری کے موقع پر صبر کا ثبوت دینا ہے۔ یہ اپنے کھونے کو ایک نئی یافت میں بدلنا ہے۔ یہ ایک انسانی واقعہ سے ربانی خوراک حاصل کرنا ہے۔ یہ ایک دنیوی تجربہ کو آخرت کے تجربہ میں تبدیل کر لینا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہ و اِنَّا الیہ راجعون کا کلمہ بندے کی طرف سے خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔ یہ خدا کے مقامِ بلند کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عبد کے مقام پر بٹھا لینا ہے۔

کھانے کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے جو آداب بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد کرے۔ وہ کہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (اللہ کے لیے شکر اور تعریف ہے جس نے مجھے کھانا کھلایا، جس نے مجھے پانی پلایا اور جس نے مجھے اسلام والوں میں سے بنایا)

انسان کھانا اور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ چیزیں اس کو ساری عمر تک مسلسل درکار ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ضرورت کو انتہائی کامل انداز میں پورا فرمایا ہے۔ زمین پر ایک طرف بہت بڑی مقدار میں پانی مہیا کر دیا ہے۔ دوسری طرف اس کا انتظام کر دیا ہے کہ آدمی معمولی محنت سے ہر قسم کی غذائیں اپنے لیے تیار کرلے۔ اسی اعلیٰ انتظام کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے کہ زمین کے ہر حصہ میں آدمی کسی رکاوٹ کے بغیر پانی اور خوراک حاصل کرکے کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔

ایک مومن جب بھوک کے وقت کھانا کھاتا ہے اور پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کا پورا وجود اس احساس میں ڈھل جاتا ہے کہ کیسا عظیم ہے وہ خدا جس نے میرے لیے یہ قیمتی انتظام کیا۔ اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو میں بھوک اور پیاس سے تڑپتا رہتا۔ مجھے نہ کہیں کھانا ملتا جس سے میں اپنی بھوک مٹاؤں اور نہ مجھے پانی ملتا جس سے میں اپنی پیاس بجھاؤں۔ اس کی روح کا یہ اعتراف اس کی زبان پر حمد کے کلمات کی صورت میں جاری ہو جاتا ہے۔

جسمانی غذا کو پاکر مومن کو مزید یاد آجاتا ہے کہ اسی طرح خدا نے میرے لیے روحانی غذا کا بھی کامل انتظام فرمایا ہے۔ وحی و الہام کے ذریعہ اس نے اپنی مرضی کا علم اتارا اور اس کو ممکن بنایا کہ میں اس علم کے مطابق زندگی گزار کر اپنے لیے ابدی کامیابی کا استحقاق پیدا کرسکوں۔ یہ یاد اس کے شکر اور حمد کے احساس میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اپنے اس رب کی حمد کرتا رہے جس نے اس کے رزق جسمانی کا بھی اعلیٰ انتظام کیا ہے اور رزقِ روحانی کا بھی اعلیٰ انتظام۔

اللہ سے پناہ مانگنا

شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ وہ برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ آدمی کو بہکا کر حق کے راستہ سے ہٹا دے اور اس کو ناحق کے راستہ پر ڈال دے۔ شیطان کے فتنہ سے بچنے کا طریقہ اسلام میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی آدمی کے ذہن میں کوئی شیطانی وسوسہ آئے تو وہ فوراً کہے : اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ، اللّٰھمّ انی اعوذ بک من ھمزات الشیاطین (ملعون شیطان سے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ، خدایا تو مجھے شیطانوں کے بہکاوے سے بچا)

دنیا کی زندگی میں آدمی کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں۔ انھیں تجربات کے دوران شیطان آدمی کو بہکاتا ہے۔ وہ آدمی کی سوچ کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ پر ڈال دینا چاہتا ہے۔ کبھی وہ آدمی کے اندر فخر کا جذبہ ابھارتا ہے۔ کبھی اس کو سرکشی پر آمادہ کرتا ہے۔ کبھی اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکاتا ہے۔ اسی طرح مختلف مواقع پر وہ آدمی کے اندر حسد، بغض، کینہ، انتقام بے انصافی، خیانت، بے اعترافی، انانیت جیسے جذبات ابھار کر یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی کو جنت کے راستہ سے ہٹائے اور اس کو دوزخ کے راستہ پر ڈال دے۔

شیطان کے مقابلہ میں آدمی کمزور ہے۔ مگر اللہ کی مدد سے وہ اس پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت وہ شیطان کی طرف سے چوکنا رہے۔ جیسے ہی شیطان اس کے ذہن میں کوئی برا خیال ڈالے، وہ فوراً تعوذ کے کلمات ادا کر کے خدا سے پناہ مانگنے لگے۔ آدمی اگر ایسا کرے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ وہ شیطان کے مقابلہ میں آدمی کا قلعہ بن جائے گا۔

آدمی جب شیطان کے وسوسہ کا اثر قبول نہیں کرتا، وہ شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ کا طالب بن جاتا ہے تو اللہ نہ صرف اس کو شیطان کے فتنہ سے بچاتا ہے بلکہ اس کو مزید نیکی کی توفیق دے کر اس کے ایمان کو اور زیادہ طاقت ور بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے راستہ کو اس کے لیے اور زیادہ روشن کر دیتا ہے۔

گمراہی کے فتنوں سے اللہ کی پناہ چاہنا گویا اپنی عبدیت کا اقرار اور خدا کی قدرت کا اعتراف ہے۔ یہ اقرار و اعتراف بلاشبہ سب سے بڑا عمل ہے، اس سے بڑا عمل اور کوئی نہیں۔

نیند سے اٹھنا

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رات کو جب سونے کے لیے اپنے بستر پر جاتے تو فرماتے : اللّٰھمّ باسمک اموتُ واَحیٰی (اے اللہ، میں تیرے نام سے مرتا ہوں اور تیرے نام سے جیتا ہوں) اور جب آپ سوکر اٹھتے تو فرماتے : اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحیَانَا بَعدَمَا اَمَاتَنَا وَاِلَیہِ النُّشُور (شکر اور تعریف ہے اللہ کے لیے جس نے ہم کو زندہ کیا موت دینے کے بعد اور اسی طرح قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا ہے)

جاگنا اور سونا آدمی کے لیے زندگی اور موت کی علامت ہے۔ دن کی بیداری کے بعد رات کے وقت آدمی جب سوتا ہے تو گویا وہ زندہ رہنے کے بعد مرجاتا ہے۔ پھر صبح کو جب وہ سوکر اٹھتا ہے تو یہ گویا اس حقیقت کی پیشگی اطلاع ہوتی ہے کہ اسی طرح آخری موت کے بعد آدمی دوبارہ زندہ ہوگا اور حساب کتاب کے لیے حشر کے میدان میں اکٹھا کیا جائے گا۔

دنیا میں آدمی کو اس طرح زندگی گزارنا ہے کہ یہاں کا ہر واقعہ اس کے لیے آخرت کی یاددہانی بن جائے، وہ ہر واقعہ میں آنے والی آخرت کی تصویر دیکھتا رہے۔ سونا اور جاگنا بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے۔ وہ آدمی کو زندگی بعد موت کی یاد دلاتا ہے۔

انسان کے معاملہ کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد جب وہ مرتا ہے تو وہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کو ایک اور دنیا میں دوبارہ پیدا ہونا ہے۔ موجودہ دنیا عمل کی جگہ ہے، آنے والی دوسری دنیا انجام پانے کی جگہ ہوگی۔ اس کے بعد آدمی کی ابدی زندگی شروع ہوگی جو یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔

یہ اہم ترین حقیقت آدمی کو روزانہ سونے اور دوبارہ جاگنے کی صورت میں یاد دلائی جاتی ہے۔ آدمی جب سوتے وقت اور پھر جاگنے کے بعد مذکورہ کلمات اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو وہ اس یاددہانی کو اپنے شعور کا حصّہ بناتا ہے۔ وہ دنیا کے عمل کو آخرت کے تذکرہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

مومن کی سوچ آخرت رخی سوچ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر دنیوی تجربہ مومن کے لیے آخرت کے تجربہ میں ڈھل جاتا ہے اور اسی طرح سونا اور جاگنا بھی۔

سادگی

ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم لوگ سنتے نہیں، کیا تم لوگ سنتے نہیں۔ بے شک سادگی ایمان سے ہے، بے شک سادگی ایمان سے ہے (الَا تَسْمَعُوْنَ الا تسمعون۔ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ)

مومن جب اللہ کی عظمت کو دریافت کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں اپنا وجود اس کو بالکل عاجز دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر آخری حد تک تواضع کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا پورا وجود عبدیت کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس کی آواز نرم پڑ جاتی ہے۔ اس کی رفتار پست ہو جاتی ہے۔ اس کے پورے رویہ پر سنجیدگی کا انداز چھا جاتا ہے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مزاج سادگی کا مزاج بن جاتا ہے۔ کھانے، کپڑے، مکان، ہر چیز میں اس کو سادگی کا طریقہ پسند آنے لگتا ہے۔ نمائشی چیزوں سے اس کو وحشت ہو جاتی ہے۔ اس کی روح کو سادگی میں لذت ملتی ہے نہ کہ تکلفات میں۔

ایمان آدمی کو مصنوعی چیزوں سے ہٹا کر فطرت کی طرف لے جاتا ہے، اور فطرت کی دنیا میں سادگی ہی سادگی ہے، وہاں بناوٹ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سادگی مومن کا مزاج اور اس کا لباس ہے۔ ایمان آدمی کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے، اس کو ایک لفظ میں فطری سادگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ فطرت کی سطح پر سادگی ہی سادگی ہوتی ہے۔ اسی طرح فاطر کائنات کا شعور آدمی کے اندر جو مزاج بناتا ہے وہ بھی تمام تر سادگی ہوتا ہے۔

مومنانہ سادگی کا یہ مزاج قدرتی طور پر اس کے ظاہری رویہ میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس کو سادہ کپڑے پسند آتے ہیں۔ سادہ رہن سہن میں اسے لذت ملتی ہے۔ سادہ گھر اور سادہ ساز و سامان میں اس کو سکون ملتا ہے۔ سادہ ماحول میں رہنا اس کے لیے محبوب ترین چیز بن جاتا ہے۔

مومن ایک سادہ انسان ہوتا ہے، اپنے اندرونی احساسات کے اعتبار سے بھی اور اپنے ظاہری معاملات کے اعتبار سے بھی۔

اسلامی اخلاق

ایمان کی رسّی

عن ابی سعیدٍ، عنِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَثَلُ المُؤمنِ ومَثَلُ الایمان کمثَل الفَرس فی آخیَّتہٖ یجول ثمَّ یرجعُ الی آخیَّتہٖ (رواہ البیہقی)

ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال گھوڑے کی مانند ہے جو رسی میں بندھا ہوا ہو۔ وہ گھومتا ہے پھر اپنی رسّی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ایک گھوڑا پانچ میٹر کی رسّی میں بندھا ہوا ہو تو اس کی ساری حرکت رسی کی لمبائی کے بقدر ہوگی۔ وہ چاروں طرف گھومے گا مگر پانچ میٹر سے آگے نہ جاسکے گا۔ یہی مثال مومن کی ہے۔ مومن کا ایمان اس کے لیے حدبندی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ وہ اتنا ہی جاتا ہے جتنا اس کا ایمان اس کو اجازت دے۔ ایمان کی حد آتے ہی وہ مجبور ہوتا ہے کہ فوراً ٹھہر جائے۔

اس کا ایمان اس کو صرف حلال کمائی کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے وہ حلال دائرہ میں کماتا ہے اور جہاں حرام کا دائرہ شروع ہو وہاں وہ فوراً رک جاتا ہے۔ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے۔ مومن کی زبان حق بات بولتی ہے، ناحق بات بولنے سے اس کی زبان رکی رہتی ہے۔ وہ انصاف کا معاملہ کرتا ہے، بے انصافی کا معاملہ کرنے سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔ اس کو کسی کے خلاف اظہار رائے کرنا ہو تو وہ دلائل کی بنیاد پر اظہار رائے کرتا ہے، وہ عیب جوئی اور الزام تراشی کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔

اسی طرح مومن کا ایمان ہر معاملہ میں اس کی حدبندی کر دیتا ہے۔ وہ قول وعمل کی تمام صورتوں کے لیے جائز اور ناجائز کا معیار قائم کر دیتا ہے۔ مومن مجبور ہوتا ہے کہ وہ صرف جائز دائرہ میں بولے اور جائز حد کے اندر عمل کرے۔ جہاں ناجائز کی حد آجائے وہاں اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس کے پاؤں اس کے آگے بڑھنے سے رک جاتے ہیں۔

غیر مومن اگر اصول اور ضابطہ سے آزاد انسان ہے تو مومن اصول اور ضابطہ کی رسّی میں بندھا ہوا انسان۔ غیر مومن اپنے آپ کو کسی کا ماتحت نہیں سمجھتا، مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کا ماتحت بنائے ہوئے ہو۔ غیر مومن اپنی رائے اور اپنی خواہش پر چلتا ہے، مومن اس کے برعکس، خدا کے احکام اور ہدایات پر۔

ذمہ دارانہ زندگی

عن عبد اللہ بن عمر، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (متفق علیہ)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگاہ، تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کے بارہ میں پوچھا جائے گا۔

یہ حدیث ایک مثال کی صورت میں اس مومنانہ ذہن کو بتاتی ہے جس کے تحت ایک مومن کو اس دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔ یہ مثال چرواہے کی ہے۔ چرواہا ہر لمحہ اپنے آپ کو اپنے گلہ کا نگراں سمجھتا ہے۔ وہ ہر ایک جانور کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار خیال کرتا ہے۔ یہی مومن کی مثال ہے۔ مومن اس دنیا میں ایک ذمہ دار انسان کی طرح رہتا ہے۔ اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض سے بے خبر ہو کر زندگی گزارنے لگے۔

مومن ہر آن اپنا نگراں بنا رہتا ہے تاکہ جو چیزیں اس کے قبضہ میں دی گئی ہیں ان کے فرائض ادا کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ مومن وہ ہے جس کے اندر احساس فرض اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ خود اپنے اندرونی احساس کے تحت ہر کام کو درست طور پر انجام دینے کی کوشش کرے، بغیر اس کے کہ کوئی افسر اس کے کام کو دیکھنے کے لیے اس کے پاس کھڑا ہوا ہو۔

ایک شخص عوام کا سردار ہے تو اس کے اوپر سارے عوام کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہے۔ ایک شخص خاندان والا ہے تو اس کو اپنے خاندان کی نگرانی کا فرض ادا کرنا ہے۔ ایک عورت ہے تو اس کے اوپر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔ ایک شخص کسی کے یہاں ملازم ہے تو اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مالک کے ساز و سامان کی رکھوالی کرے اور اس کی جو ڈیوٹی ہے اس کو اچھی طرح انجام دے۔

ایمانی زندگی، ایک لفظ میں، ذمہ دارانہ زندگی ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں ہے، وہ کچھ چیزوں کا مالک ہے، کچھ چیزیں اس کی تحویل میں دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں گویا اس کا گلہ ہیں، اور وہ ان کا چرواہا ہے۔ خدا کی دی ہوئی ان چیزوں میں اس کو گلہ بانی والا فرض ادا کرنا ہے۔ کامیاب وہ ہے جو سچا گلہ بان بنے، اور ناکام وہ ہے جو اپنی چیزوں میں سچا گلہ بان ثابت نہ ہو سکے۔

تواضع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے میرے اوپر وحی کی ہے کہ تم لوگ آپس میں تواضع اختیار کرو۔ کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی شخص کسی کے اوپر سرکشی نہ کرے (إن الله أوحىٰ إلىّ أن تواضعوا حتى لا يفخر أحدٌ على أحدٍ ولا يبغي أحدٌ على أحدٍ) رواہ مسلم

تمام انسان اللہ کے بندے ہیں۔ تمام انسان اللہ کے مقابلہ میں عاجز مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام انسانوں کے لیے ایک ہی صحیح رویہ ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کی بڑائی کو مانتے ہوئے اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا بنا لیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو عبدیت کہا جاتا ہے۔

مگر موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو عارضی طور پر آزادی دے دی گئی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ وہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے عجز کی روش کو اختیار کر لے، یا اس سے انحراف کر کے سرکش اور متکبر بن جائے۔ جو شخص اس آزمائش میں پورا اترے گا، اس کے لیے جنت ہے اور جو شخص اس آزمائش میں ناکام رہے اس کے لیے جہنم۔

اس آزمائش کا سب سے بڑا میدان وہ ہے جو انسانی تعلقات کے دوران میں پیش آتا ہے جب ایک شخص کا سابقہ دوسرے شخص سے پڑتا ہے تو بظاہر وہ اس کو محض ایک آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اب جس شخص کے اندر عبدیت کی نفسیات پیدا ہو چکی ہو، اس کی اندرونی نفسیات اس کو مجبور کرے گی کہ وہ ایسے موقع پر تواضع کا انداز اختیار کرے۔ اس کے برعکس جو شخص عبدیت کی نفسیات سے خالی ہو وہ ایسے موقع پر سرکش بن جائے گا، وہ فخر اور تکبر والا انداز اختیار کرے گا۔

خدا پرست انسان بندوں کے معاملہ میں متواضع انسان ہوتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ چھوڑنا اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بندوں کے مقابلہ میں بھی سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرے۔ ایسا انسان، عین اپنی نفسیات کے تحت، ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتا ہے نہ کہ محض اپنے جیسے کسی آدمی کا معاملہ۔

تواضع دراصل حقیقت پسندانہ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کی جو واقعی حیثیت ہے اس کے اعتبار سے واحد درست رویہ انسان کے لیے یہی ہے کہ وہ تواضع کا انداز اختیار کرے۔

سچ بولنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر لازم ہے کہ تم سچ بولو۔ کیوں کہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی آدمی کو جنت میں پہنچاتی ہے۔ اور تم پر لازم ہے کہ تم جھوٹ سے بچو۔ کیوں کہ جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی آدمی کو آگ میں پہنچاتی ہے (علیکم بالصدق فإن الصدق یھدی الی البر وإن البر یھدی إلی الجنۃ۔ وإیاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجور وإن الفجور یھدی الی النار) ابوداؤد، الترمذی

ایمان دراصل حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے۔ ایک شخص جب خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے تو گویا وہ سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ ایسا انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے سچا انسان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ وہ کبھی کسی معاملہ میں جھوٹ بات نہیں کہتا۔

سچ نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ جو آدمی سچ بولے، اس کی زبان اور اس کا ضمیر دونوں ہمیشہ ایک رہیں گے۔ وہ مصنوعی کلام سے بچا رہے گا۔ جو اس کے دل میں ہوگا وہی اس کی زبان پر ہوگا۔ اس کی روح ہمیشہ مطمئن رہے گی، کیوں کہ وہ تضادات سے خالی ہوگی۔

جو شخص قول میں سچا ہو اس کا عمل بھی سچائی میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ سچا کلام اس کی زندگی کی رہنمائی ایسے راستہ کی طرف کرتا ہے جو بالآخر اس کو جنت میں پہنچانے والا ہو۔ ایسے آدمی کے اندر فطری طور پر یہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ وہی کہے جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق اسے کہنا چاہیے اور وہی کرے جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق اسے کرنا چاہیے۔

جھوٹ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جھوٹ بولنے والا ایسی بات کہتا ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کی روح تضادات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو وہ خود اپنے علم اور اپنے احساس کی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا انسان خود ہی اپنے آپ کو بے قیمت کر لیتا ہے۔ وہ اپنے خلاف آپ گواہ بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے اوپر ہدایت کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے اور جنت کا راستہ بھی بند۔

سچ تمام نیکیوں کا دروازہ ہے اور جھوٹ تمام برائیوں کا دروازہ۔

قناعت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام کو اختیار کیا۔ اور اس کو بقدرِ ضرورت رزق ملا اور اس کو اللہ نے جو کچھ دیا اس پر اس نے قناعت کیا (قد افلح من أسلم و رُزِق کفافاً و قنّعه اللهُ بما آتاه) رواہ مسلم

اس دنیا میں آدمی بیک وقت دو تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف اس کے لیے معاشی ضرورتوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ دوسری طرف اس کو وہ عمل کرنا ہے جو آخرت میں اس کے کام آئے۔ آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ وہ دونوں تقاضوں پر یکساں حیثیت سے زور دے۔ ایک کی طرف زیادہ متوجہ ہونا ہمیشہ اس قیمت پر ہوگا کہ دوسری طرف سے اس کی توجہ ہٹ جائے۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ عمل کرے اور دنیا کے معاملہ میں بقدرِ ضرورت فراہمی پر اکتفا کرے۔ اسی کا نام قناعت ہے۔ مومن آخرت کے معاملہ میں عدم قناعت کا رویہ اختیار کرتا ہے اور دنیا کے معاملہ میں قناعت کا۔

مومن آخرت میں ملنے والی خدائی نعمتوں کا حریص ہوتا ہے۔ آخرت کے معاملہ میں حرص کی حد تک اس کا بڑھا ہوا جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں میں کم پر راضی ہو جائے، تاکہ وہ آخرت کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کر سکے۔

قناعت اس دنیا میں مومنانہ زندگی کی لازمی شرط ہے۔ قناعت پر راضی نہ ہونے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی اسی چیز کو سب سے زیادہ کھو دیتا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو عافیت کی زندگی حاصل ہو۔ غیر قانع آدمی موجودہ دنیا میں چند دن کے لیے عافیت کی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کی یہ بھاری قیمت دینی پڑے گی کہ موت کے بعد آنے والے مرحلہ میں وہ ابدی طور پر عافیت کی زندگی سے محروم ہو جائے گا۔

جو شخص قناعت نہ کرے وہ شکر کرنے والا بھی نہیں بنے گا۔ اس دنیا میں کسی کو سب کچھ نہیں مل سکتا۔ یہاں ہر آدمی کو صرف کچھ دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شکر خداوندی کا جذبہ اسی دل کے اندر امنڈ سکتا ہے جو کچھ پر راضی ہو جائے۔ غیر قانع انسان صرف شاکی بنتا ہے نہ کہ شاکر۔

وعدہ پورا کرنا

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے عہد کو پورا کرو، بے شک تم سے عہد کے بارہ میں پوچھ ہوگی

(وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا) الاسراء ۳۴

ایک شخص جب دوسرے سے کوئی عہد کرتا ہے تو گویا وہ دوسرے سے اپنا تعارف کراتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ میں تمہارے لیے کیا ثابت ہوں گا۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنے عہد کو پورا نہ کرے تو اس نے خود اپنے آپ کو باطل ثابت کیا۔ اس نے وعدہ خلافی کر کے خود اپنی حیثیت کی نفی کر دی۔

عہد کرنے کے بعد اسے پورا کرنا اعلیٰ ترین انسانیت ہے۔ یہ انسانی کردار کی نہایت اہم صفت ہے۔ جو آدمی ایک عہد کرے اور جب پورا کرنے کا وقت آئے تو وہ اس کو پورا نہ کرے، ایسا آدمی بالکل بے قیمت ہے، بندوں کے نزدیک بھی اور خدا کے نزدیک بھی۔

"عہد اللہ کے نزدیک قابل پرسش ہے" قرآن کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جب دو آدمیوں کے درمیان عہد و پیمان کا معاملہ ہو تو یہ صرف دو انسانوں کا باہمی معاملہ نہیں ہوتا، اس میں خدا بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں عہد کو توڑنا صرف ایک انسان سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے، بلکہ وہ براہ راست خدا کے ساتھ سرکشی ہے۔ وہ خدا کے مقابلہ میں جسارت کا مظاہرہ ہے۔ پھر جو شخص خدا کے مقابلہ میں جسارت کرے، اس کو زمین و آسمان کے اندر کون بچا سکتا ہے۔

حدیث میں اس کو منافق کی پہچان بتایا گیا ہے کہ آدمی وعدہ کر کے اس کو پورا نہ کرے (اذا وعد اخلف، اذا عاهد غدر) وعدہ پورا نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اصولی معاملہ میں حساس نہیں۔ اس کے نزدیک اصول کی پابندی کرنا اور اصول کو نظر انداز کر دینا دونوں یکساں ہیں۔ ایسا شخص یقینی طور پر منافق ہے۔ کیوں کہ حساسیت ایمان کی پہچان ہے اور بے حسی منافقت کی پہچان۔

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ اس کا عمل اصولوں کا پابند ہوتا ہے نہ کہ مفادات کا پابند۔ اور جو آدمی با اصول ہو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ وعدہ کرنے کے بعد اس سے پھر جائے۔ وعدہ سے پھر جانا بے اصول انسانوں کا طریقہ ہے اور وعدہ پورا کرنا با اصول انسانوں کا طریقہ۔

امانت داری

قرآن میں ہے کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو (النساء ۵۸) حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ أدِّ الامانۃ إلی مَنِ ائْتَمَنَكَ ولا تخُن مَن خانك (جو شخص تم کو امین بنائے اس کی امانت اس کو ادا کرو اور جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے، اس کے ساتھ تم خیانت نہ کرو)

ایک شخص کے پاس دوسرے شخص کی امانت ہو، خواہ وہ مال کی صورت میں ہو یا اور کسی صورت میں، تو اس کو حق دار کی طرف لوٹانا فرض ہے۔ امانت کی چیز امانت دار کی نہیں ہوتی بلکہ حق دار کی ہوتی ہے۔ اور جو چیز جس شخص کی ہو، وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ اس چیز کو اس کی طرف لوٹا دیا جائے۔

اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے جائز یا ناجائز شکایت ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی کا خیال دوسرے کے بارہ میں یہ ہو جاتا ہے کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں وہی شخص امانت دار بن سکتا ہے جو دوسروں کے رویہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی امانتیں انھیں لوٹائے۔ جو شکایت اور اختلاف سے اوپر اٹھ کر دوسروں کو ان کے حقوق ادا کرے۔

امانت کے معاملہ میں اپنے کو مالک سمجھنے کے بجائے امین سمجھنا اور اس کو ہر حال میں صاحب حق کو ادا کرنا صرف دوسرے کا معاملہ نہیں بلکہ خود اپنا معاملہ بھی ہے۔ جو آدمی اس طرح عمل کرے، وہ اس عمل کے ذریعہ اپنے ایمان کو زندہ کرتا ہے، وہ اپنی شخصیت کو اونچا اٹھاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ خائن شخص کے ساتھ بھی امانت داری کا معاملہ کرو۔ جو آدمی کسی چیز کو عذر بنا کر امانت کی ادائیگی سے رک جائے، وہ خود اپنے آپ کو پست کر لے گا، وہ اخلاقی بلندی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

امانت کو کسی کمی کے بغیر اس کے مالک تک پہنچانا، یہ بلاشبہہ ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے۔ یہ ایمان کے لازمی شرائط میں داخل ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں امانت کی ادائیگی کے امتحان میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر سوچ سکے۔ جس کے اندر یہ مزاج ہو کہ امانت کی ادائیگی کے معاملہ میں مجھے ہر حال میں اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے خیانت کا تجربہ ہو تب بھی مجھے اپنے آپ کو امانت داری پر قائم رکھنا ہے۔

نفع بخشی

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : علیٰ کلِّ مسلمٍ صدقۃٌ۔ قال ارأیتَ إن لم یجِدْ۔ قال یعملُ بیدیہِ فینفعُ نفسہ ویتصدّقُ۔ قال ارأیتَ إن لم یستطعْ۔ قال یُعینُ ذا الحاجۃِ الملھوف۔ قال ارأیتَ إن لم یستطع۔ قال یأمُرُ بالخیرِ۔ قال ارأیتَ إن لم یفعلْ۔ قال یُمسکُ عن الشرِّ فانّھا صدقۃٌ (متفق علیہ)

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر مسلمان پر صدقہ ہے۔ پوچھا کہ اگر اس کے پاس نہ ہو۔ فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرے اور پھر اپنے کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ پوچھا کہ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ فرمایا کہ حاجت مند بیکس کی مدد کرے۔ پوچھا کہ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ فرمایا کہ بھلائی کی تلقین کرے۔ پوچھا کہ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ فرمایا کہ وہ لوگوں کو اپنے شر سے بچائے، کیوں کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

اسلام آدمی کے اندر نفع بخشی کی روح پیدا کرتا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ دنیا میں دینے والا بن کر رہے نہ کہ لینے والا۔

مسلمان کے پاس اگر مال ہے تو وہ اپنے مال سے دوسروں کو نفع پہنچائے گا۔ اگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو وہ محنت کرے گا اور پھر اپنی ضرورت بھی پوری کرے گا اور دوسروں کے کام آنے کی بھی کوشش کرے گا۔ اگر وہ مال نہیں دے سکتا تو وہ اپنی بات سے دوسروں کی مدد کرے گا، خواہ ایک مظلوم کی حمایت کرنا ہو یا کسی سے کوئی بھلائی کا کلمہ کہنا ہو۔ حتیٰ کہ اگر آدمی کا یہ حال ہو جائے کہ وہ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ پہنچانے کے قابل نہ ہو تو وہ اس بات کا اہتمام کرے گا کہ وہ کسی کے لیے مسئلہ نہ بنے، اس کی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

مومن دنیا میں مفید بن کر رہتا ہے، یا کم از کم وہ اپنے آپ کو آخری حد تک بے مسئلہ بنا لیتا ہے۔ ان دو کے بعد کوئی تیسرا درجہ مومن و مسلم کے لیے نہیں۔

ایمان آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ بناتا ہے۔ اس کا ایمان اس سے کہتا ہے کہ تم اگر دوسروں کو نفع نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم انھیں نقصان نہ پہنچاؤ، کیونکہ یہ بھی دوسروں کے حق میں خیر خواہی ہے۔

محنت

امام بخاری نے حضرت مقداد بن معدی کرب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر کھانا وہ ہے جو آدمی اپنے دونوں ہاتھوں کی محنت سے حاصل کر کے کھائے (ما أكل أحدٌ طعاماً قطُّ خيراً من أن يأكلَ من عملِ يدَيه)

اسلام مومن کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ محنت اور عمل کا مزاج ہے۔ مومن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں آدمی کو صرف وہی ملے گا جس کے لیے اس نے واقعۃً عمل کیا ہو (ليس للانسان الا ما سعىٰ) یہ عقیدہ مومن کو آخرت کے بارہ میں آخری حد تک باعمل بنا دیتا ہے، اور جب آخرت کے معاملہ میں اس کے اندر عمل کا مزاج بنتا ہے تو یہی چیز اس کو دنیا کے معاملہ میں بھی باعمل بنا دیتی ہے۔

مومن مانگ کر لینے کے بجائے کر کے لینا پسند کرتا ہے۔ مومن دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے خود اپنے ہاتھ پاؤں سے عمل کر کے اپنی معاش کماتا ہے۔ مومن آخری حد تک خدا پر بھروسہ کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کو گوارا نہیں ہوتا کہ خود محنت نہ کرے اور دوسروں سے ملی ہوئی رعایت پر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو جسم دیا ہے، وہ ایک اعلیٰ ترین قسم کی زندہ مشین ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی بہترین صلاحیتیں پوری طرح موجود ہیں۔ مومن اس کو خدا کا قیمتی عطیہ سمجھتا ہے اور قلب اور روح کی تمام گہرائیوں کے ساتھ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ شکرگزاری اس کے لیے مزید محرک ہوتی ہے کہ وہ اس عطیہ کو عمل میں لائے، وہ اپنے جسم کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔

مومن اپنے عمل کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ مومن کی یہ نفسیات اس کے اندر خود بخود محنت کا مزاج پیدا کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذہن اور جسم کی غیر معمولی طاقتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تسخیری صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے ذہن اور جسم کی طاقتوں استعمال نہ کرنا گویا براہ راست اللہ کی ناشکری ہے۔ یہ خدا کے خلاف ایک قسم کا عدم اعتماد ہے۔ مومن اللہ کا شکر کرنے والا اور اللہ پر بھروسہ کرنے والا انسان ہوتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں پر اعتماد کرے نہ کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے عطیہ پر۔

اچھا گمان

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ ایک مومن کو چاہیے کہ وہ دوسرے مومن کے بارہ میں نیک گمان کرے (النور ۱۲)
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ظن سے بچو، کیوں کہ ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے (ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، متفق علیہ)

مومن کا طریقہ یہ ہے کہ اصلاً وہ لوگوں کے بارہ میں اچھا خیال رکھے۔ حتی کہ اگر اس کو کسی کے بارہ میں برائی کا شبہہ ہو تو وہ اس کا تجسس بھی نہ کرے۔ اگر اس کے علم میں کسی کی کوئی ایسی بات آئے جو بظاہر ٹھیک نہ ہو تب بھی وہ اچھا گمان کرتے ہوئے اس کو نظر انداز کر دے۔ وہ سارے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دے۔

مومن کسی کے بارہ میں غلط رائے صرف اس وقت قائم کرتا ہے جب کہ آخری اور حتمی طور پر وہ چیز ثابت شدہ بن چکی ہو۔ مومن کا نظریہ دوسروں کے بارہ میں یہ ہوتا ہے کہ اچھی رائے قائم کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ میں بری رائے قائم کرنے میں غلطی کروں۔

گمان کی بنیاد پر کسی کے بارہ میں بری رائے قائم کرنا محض ایک سادہ سی بات نہیں ہے۔ وہ ایک اخلاقی جرم ہے جو اللہ کے نزدیک سخت سزا کا سبب ہے۔ اس لیے مومن اس قسم کی رائے زنی سے آخری حد تک بچتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے دوسرے کا محافظ بن جاتا ہے۔

اکثر حالات میں کسی انسان کے پاس وہ پوری معلومات موجود نہیں ہوتیں جو کسی مسئلہ میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کسی آدمی کے لیے محتاط رویہ یہی ہے کہ وہ ایسے معاملات میں خاموشی اختیار کر لے۔ اگر وہ کسی معاملہ میں بولنا ضروری سمجھتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی مکمل تحقیقات کرے۔ اس کے بعد ہی اس معاملہ میں اس کا بولنا حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔

مومن اپنے بارہ میں سخت اور دوسرے کے بارہ میں نرم ہوتا ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں پر سختی سے اپنا محاسبہ کرتا ہے، مگر دوسروں کی قابل گرفت باتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ اپنے کو عزیمت کے معیار سے جانچتا ہے اور دوسروں کو رخصت کے معیار سے۔

اچھا گمان مومنانہ روش ہے اور برا گمان غیر مومنانہ روش۔

صحیح رائے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے : اللهمّ أرِنا الحقّ حقًا وارزقنا اتّباعه وأرِنا الباطلَ باطلًا وارزقنا اجتنابه وأرِنا الاشياءَ كما هِيَ (اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کو اختیار کرنے کی توفیق دے ۔ اور ہمیں باطل کو باطل کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے ۔ اور ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)

چیزوں کے بارہ میں رائے قائم کرنے کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک ہے بے لاگ رائے قائم کرنا ۔ اور دوسرا ہے متاثر ذہن کے تحت رائے قائم کرنا ۔ مومن کی سنجیدگی اور اس کا احساس ذمہ داری اُس کو اِس سے روکتا ہے کہ وہ کسی چیز کے بارہ میں متاثر ذہن کے تحت ایک خلاف واقعہ رائے قائم کرلے ۔ وہ آخری حد تک یہ کوشش کرتا ہے کہ چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھے اور عین وہی رائے قائم کرے جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو ۔

خلاف واقعہ رائے قائم کرنے کے مختلف اسباب ہیں ۔ کبھی انانیت اور مفاد پرستی جیسے جذبات صحیح سوچ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ۔ کبھی ناقص معلومات کی بنا پر آدمی رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا ہے ۔ اس بنا پر مومن اس معاملہ میں بے حد چوکنا رہتا ہے ۔ وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ چیزوں کو بے لاگ ذہن سے دیکھے ۔ اس معاملہ میں اس کی سنجیدگی اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اللہ سے دعا کرنے لگتا ہے کہ اللہ اس کو غلط رائے قائم کرنے سے بچائے ۔

چیزوں کو ویسا ہی دیکھنا جیسا کہ وہ ہیں ، یہ صحیح سوچ کی لازمی شرط ہے ، اور صحیح سوچ صحیح عمل کی لازمی شرط ہے ۔ اس لیے مومن اس معاملہ میں بے حد حساس ہوتا ہے ۔ وہ اس کا سخت اہتمام کرتا ہے کہ اس کی سوچ واقعہ کے خلاف نہ ہو ۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خلاف واقعہ سوچ کا سب سے زیادہ نقصان خود اس کو اٹھانا پڑے گا ۔

مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھے ۔ ایسی نظر کسی آدمی کو اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ اپنے ذہن کو ہر قسم کے منفی رجحانات سے خالی کرلے ۔ دوسروں کی طرف سے ناخوش گواری کا تجربہ ہو تب بھی وہ اپنے آپ کو اعتدال پر قائم رکھے ۔

آیاتِ بینات

حکمت کی بات

امام ابوداؤد (۲۷۵-۲۰۲ھ) قندھار کے قریب بجستان کے رہنے والے تھے۔ وہ امام احمد بن حنبل کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے طویل اسفار کے بعد پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں ان میں سے چار ہزار آٹھ سو حدیثوں کو منتخب کر کے سنن ابی داؤد میں درج کیا۔ تاہم امام موصوف نے لکھا ہے کہ آدمی اگر ان میں سے چار حدیثوں کو پکڑ لے تو وہ اس کے دینی فہم کے لئے کافی ہو جائے:

انما الاعمال بالنیات

عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔

من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ

بہتر اسلام یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ بات بولنا چھوڑ دے

لا یکون المومن مومنا حتی یرضی لاخیہ ما یرضاہ لنفسہ

کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

الحلال بیّن والحرام بیّن وبین ذالك امور مشتبہات فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہہ کی چیزیں ہیں جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو بچالیا۔

امام ابوداؤد کے بہت سے نہایت قیمتی اقوال ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

الشھوۃ الخفیۃ حب الریاسۃ

پوشیدہ شہوت یہ ہے کہ آدمی سرداری کو پسند کرنے لگے۔

خیر الکلام ما دخل الاذن بدون اذن

بہترین بات وہ ہے جو کان میں بلا اجازت داخل ہو جائے۔

من اقتصر علی لباس دون ومطعم دون اراح جسدہ

جس شخص نے کمتر لباس اور کمتر کھانے پر قناعت کی اس نے اپنے جسم کو آرام پہنچایا۔

ایمان اگر آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ پیدا ہو جائے تو وہ ساری اہمیت صرف حقیقت کو دینے لگے گا۔ بے فائدہ باتوں سے اسے دلچسپی نہ رہے گی۔ اپنے اور غیر کا فرق اس کی نظر میں ختم ہو جائے گا۔ اس کی حساسیت اتنی بڑھ جائے گی کہ وہ شبہہ کی چیزوں سے بھی بچنے لگے گا۔ اور اپنے کو بڑا بنانے کا جذبہ اس کے اندر باقی نہ رہے گا۔ وہ ایسی بات بولے گا جو سیدھی لوگوں کے دلوں تک پہنچے۔ اس کی زندگی بالکل سادہ زندگی بن جائے گی۔

علم

العلماء ورثة الانبیاء (حدیث)

علما پیغمبروں کے وارث ہیں۔

اللھم ارحم خلفائی۔ قلنا من خلفاؤك یارسول اللہ۔ قال الذین یحفظون سنتی ویعلمونھا للناس (حدیث)

اے اللہ، میرے خلفا پر رحم کر۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون لوگ آپ کے خلفا ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہ لوگ جو میری سنت کی حفاظت کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

لیس شئ اعز من العلم۔ الملوك حكام علی الناس والعلماء حكام علی الملوك (ابو الاسود)

علم سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ عوام پر حکومت کرتے ہیں اور علم والے لوگ بادشاہوں پر حکومت کرتے ہیں۔

عن عون بن عبداللہ قال قلت لعمر بن عبدالعزیز یقال: ان استطعت ان تکون عالما فکن۔ فان لم تستطع فکن متعلما۔ فان لم تکن متعلما فاحبھم۔ فان لم تحبھم فلا تبغضھم۔ فقال عمر سبحان اللہ لقد جعل اللہ لہ مخرجا

عون بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم عالم بن سکتے ہو تو بنو۔ اگر عالم نہیں بن سکتے تو طالب علم بنو۔ اگر تم طالب علم نہیں بن سکتے تو ان سے محبت کرو۔ اگر تم ان سے محبت نہیں کر سکتے تو ان سے بغض نہ رکھو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ سن کر کہا سبحان اللہ۔ اس کو خدا نے راستہ دیدیا۔

علامہ شاطبی نے لکھا ہے ـــــــ مستحب، مندوب، فرض، اور مکروہ اور حرام کی جو تقسیمیں ہیں، تقرب الی اللہ اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیوں کہ اصل مقصود تزکیۂ نفس ہے۔ جو چیز تزکیۂ نفس میں مدد دے وہی اہم ہے، چاہے وہ مستحب ہو یا فرض۔ اور جو برائی کی طرف لے جائے وہ ممنوع ہے، خواہ وہ مکروہ ہو یا حرام۔

شاطبی، الموافقات، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ، جلد ۳ صفحہ ۲۴۱

افضل العلم الورع والتفکر (حسن بصری) افضل علم پرہیزگاری اور غور و فکر ہے۔

اُس دن

قرآن میں آخرت کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگ سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ (یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون، القلم) یہاں کشفِ ساق (پنڈلی کھولنے) کا لفظ استعارہ کے طور پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ تمام حقیقتیں کھول دی جائیں گی جو موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت سے چھپا دی گئی ہیں۔ العوفی نے عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تشریح میں کہا کہ جب معاملہ سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور تمام اعمال ظاہر ہو جائیں گے (حین یکشف الامر وتبدو الاعمال، تفسیر ابن کثیر)

جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لیے یا ذاتی فائدہ کے لیے دینی زندگی اختیار کرے وہ جھوٹا دیندار ہے۔ مگر دنیا میں یہ حقیقت چھپی رہتی ہے۔ اس لیے یہاں جھوٹے دیندار کو بھی وہی عزت مل جاتی ہے جو سچے دیندار کو ملنی چاہیے۔ مگر آخرت میں اس قسم کا فریب ممکن نہ ہوگا۔ آخرت کے بدلے ہوئے حالات میں ایسے لوگ بالکل بے جگہ ہو جائیں گے۔ دنیا میں بناوٹی باتیں کر کے مقبولیت حاصل کرنے والے آخرت میں اپنے آپ کو بے زبان محسوس کریں گے، کیوں کہ آخرت میں تمام اہمیت صرف قولِ سدید کی ہوگی، اور اس قسم کے کلام کے لیے وہ لوگ اپنے آپ کو وہاں نااہل پائیں گے۔ مادی چیزوں کی بنیاد پر بڑائی حاصل کرنے والے وہاں چھوٹے ہو جائیں گے، کیوں کہ آخرت میں صرف روحانی چیزوں میں عظمت ہوگی۔ دوسری تمام چیزیں اس روز اپنی عظمت کھو دیں گی۔ غیر حقیقی مسائل کا نعرہ لگا کر بھیڑ جمع کرنے والے وہاں تنہا ہو جائیں گے، کیوں کہ آخرت میں لوگوں کی توجہ کا مرکز صرف وہ چیزیں ہوں گی جو حقیقی طور پر بامعنی حیثیت رکھتی ہوں۔

دنیا میں آدمی سچائی کو نظر انداز کر کے اونچے مقامات پاتا ہے، آخرت میں سچائی کا اعتراف کرنے والا اونچے مقامات کو پائے گا۔ دنیا میں خیانت کر کے آدمی مال کا مالک بنتا ہے، آخرت میں دیانت و امانت وہ چیز ہوگی جو آدمی کو صاحب سرمایہ بنائے۔ دنیا میں انسانوں کو خوش کر کے مفادات حاصل ہوتے ہیں، آخرت میں خدا کو خوش کرنا آدمی کو تمام مفادات کا مالک بنائے گا۔

دو قسم کے انسان

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔

(البقرہ ۲۵۷)

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا اعتماد خدا پر ہو، جو اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جانتے ہوئے اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کرتے ہوں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا اعتماد غیر خدا پر ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ جب انھیں کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ خدا کے علاوہ دوسری دوسری باتوں کی بنیاد پر اپنی راہ عمل متعین کریں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی و مددگار بناتے ہیں، ان کا ذہن خدارخی بن جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدائی انداز میں سوچتے ہیں۔ وہ اپنی تدبیروں سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے جذبات کا رُخ انسان کے بجائے خدا کی طرف رہتا ہے۔ وہ غصہ اور انتقام کے بجائے ہمیشہ صبر اور معافی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ——— یہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کرنے والے لوگ ہیں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی نہ بنائیں ان کا ولی شیطان بن جاتا ہے۔ ان کا ذہن ہمیشہ تخریب کاری کی طرف چلتا ہے۔ وہ سازش اور انتقام کے طریقوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو ان کا ذہن فوراً منفی تدبیروں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کو کبھی روشنی میں آنا نصیب نہیں ہوتا ——— یہ وہ لوگ ہیں جن کو شیطان نے اجالے سے اندھیرے کی طرف دوڑا دیا۔ اوّل الذکر گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی ہے، دوسرے گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں ناکامی۔

مومن و کافر کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت آئے گی اور سارے لوگ خدا کے حضور جمع کئے جائیں گے تاکہ وہ اپنی اس کمائی کو دیکھیں جو انھوں نے اپنے آگے کے لئے بھیجی تھی۔ اس وقت منکر اور سرکش کا یہ حال ہوگا کہ جب وہ اپنے انجام کو دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا: اے کاش میں مٹی ہوتا (و یقول الکافر یالیتنی کنتُ ترابا)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ جب ان کو ابو لولو فیروز نے زخمی کیا اور آپ کا آخر وقت آگیا تو آپ کے صاحبزادے آپ کا سر اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے حضرت عمر نے کہا: اے عبد اللہ، میرا رخسار زمین سے ملادے (الصق خدی بالارض یاعبد اللہ) آپ کے صاحبزادے نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا چہرہ زمین پر رکھ کر کہا۔ اے عمر، تیری خرابی ہے اور تیری ماں کی خرابی ہے، اگر خدا نے تجھے معاف نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی (طبقات ابن سعد)

ان دونوں واقعات کا مقابلہ کرکے دیکھئے۔ جو بات کافر کی زبان سے آخرت میں نکلے گی وہ مومن کی زبان سے اسی دنیا میں نکل رہی ہے۔ کافر موت کے بعد آنے والی دنیا میں چاہے گا کہ کاش وہ مٹی میں مل جاتا۔ مومن موت سے پہلے کی دنیا میں کہہ رہا ہے کہ مجھے مٹی میں ملا دو۔

خدا جب سامنے ظاہر ہو جائے گا تو کس کی مجال ہے کہ اس سے سرکشی کرے۔ اس وقت ہر آدمی اس کے سامنے جھک جائے گا۔ مگر خدا کے لئے جھکنا صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے سامنے آنے سے پہلے ہو۔ یہی کافر اور مومن کا فرق ہے۔ کافر اس وقت جھکے گا جب خدا عیاناً اس کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ مگر مومن اس وقت خدا کے لئے جھک جاتا ہے جب کہ خدا ابھی پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے۔

لوگ خدا کے باغی صرف اس لئے ہیں کہ خدا آج ان کے سامنے موجود نہیں۔ جب خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ دکھائی دینے لگے تو کون اس کا باغی بن سکتا ہے۔ انسان تو شیر کے سامنے بھی اس کا باغی نہیں بنتا، پھر شیر کے خالق کے سامنے کون اس کا باغی بننے کی جرأت کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر آخرت میں گذرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گذر جاتا ہے۔ کافر خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑے گا۔ مومن وہ ہے جو خدا کو دیکھے بغیر ڈھ پڑے۔

کلمۂ معرفت

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ (الاحقاف ۹)

کہو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعہ آتا ہے۔ اور میں صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔

یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ ایک واقعہ کے ذیل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم، میں نہیں جانتا، اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں، کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ (واللہ ما ادری وانا رسول اللہ مایفعل بی ولا بکم، التفسیر المظہری، ۸/۳۹۶)

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ کلمۂ عبدیت ہے نہ کہ کلمۂ آخرت۔ یعنی یہ عبدیت کے احساس کے تحت نکلے ہوئے الفاظ ہیں، یہ آخرت کے فیصلہ کا اعلان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے لیے اور اپنے تمام سچے بندوں کے لیے مغفرت کا اعلان فرمایا ہے۔ مگر ایک صاحب معرفت بندہ جب یہ سوچتا ہے کہ میں عاجز مطلق ہوں اور خدا قادر مطلق ہے۔ اور آخرت کے فیصلہ کا اختیار یک طرفہ طور پر صرف خدا کے ہاتھ میں ہے تو رحمت کے یقین کے باوجود وہ کانپ اٹھتا ہے۔ خدا کی عظمت کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

ایک طرف اس کو خدا کی رحمت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا کی پکڑ کا اندیشہ۔ یہ صورت حال اس کو امید اور خوف کے عین درمیان کھڑا کر دیتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس کو اپنا معاملہ بالکل ففٹی ففٹی (fifty-fifty) کا سا نظر آنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مایفعل بی ولا بکم" معرفت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جس آدمی کو خدا کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی زیادہ اس کے اندر عظمت خداوندی کا احساس بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمت خداوندی کا حقیقی ادراک آدمی کی زبان سے جو کلمہ نکلواتا ہے وہ یہی کلمہ ہے۔

آدم و ابلیس کا قصہ

اسلام میں زندگی کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں آتا ہے وہ اس لیے آتا ہے کہ وہ یہاں لوگوں کے درمیان رہ کر امتحان دے اور پھر اپنے عمل کے مطابق اپنا انجام پانے کے لیے دوبارہ خدا کے یہاں چلا جائے۔

آدمی کا امتحان کس چیز میں ہے، اس کو آدم اور ابلیس کے قصہ میں بتایا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو پیدا کیا تو فرشتوں سے اور ابلیس سے کہا کہ اس کے آگے جھک جاؤ۔ فرشتے فوراً خدا کے حکم کے مطابق آدم کے سامنے جھک گیے۔ مگر ابلیس جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ تونے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے بنایا ہے۔ اس لیے میں آدم سے بہتر ہوں۔ میں آدم کے آگے نہیں جھکوں گا۔

اس وقت خدا نے آدم اور ابلیس دونوں کو زمین پر بھیج دیا۔ ابلیس نے کہا کہ میں آدم کی تمام نسل کو بہکاؤں گا۔ خدا نے کہا کہ: آدم کی اولاد میں جو لوگ تیری راہ چلیں گے تو میں تجھ کو اور ان کو سب کو دوزخ میں ڈال دوں گا (فمن تبعک منھم لاملئن جھنم منک ومن الناس اجمعین)

اب دیکھئے کہ ابلیس کی وہ راہ کیا تھی جس پر وہ چلا۔ وہ یہ تھی کہ اس کے اندر آدم کے مقابلہ میں بڑائی کی نفسیات آگئی (انا خیر منہ) اس نے سمجھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے میں آدم کے مقابلہ میں نہیں جھکوں گا۔ میں آدم کا احترام نہیں کروں گا۔

دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا معاملہ دوسرے شخص سے پڑتا ہے۔ اب اگر آپ ایسا کریں کہ سامنے کا آدمی جب آپ کو اونچا اور طاقت ور دکھائی دے تو آپ اس کا لحاظ کریں اور اس کا حق اسے دیں۔ اور جب سامنے کا آدمی نیچا اور کمزور نظر آئے تو اس کو نظر انداز کریں اور اس کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو یہ شیطانی طریقہ کی پیروی کرنا ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا سلوک معلوم اصولوں کا پابند ہو۔ آپ ہر حال میں انھیں اعلیٰ اصولوں کی پابندی کریں، خواہ دوسرا فریق اونچا دکھائی دیتا ہو یا نیچا۔ خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور۔

امتحان

احد کی جنگ (۳ھ) میں اہل ایمان کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ۷۰ مسلمان شہید ہوگیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید زخم آئے۔ ان واقعات پر مدینہ کے مسلمان غم زدہ تھے۔ قرآن میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ دو جماعتوں کی مڈبھیڑ کے وقت تم کو جو مصیبت پیش آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی۔ اور اس لیے تھی تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جان لے جو منافق ہیں (آل عمران ۱۶۶-۶۷)

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت ہے جو مختلف الفاظ میں مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ سورہ نمبر ۵۷ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی مصیبت جو آتی ہے، خواہ وہ جس صورت میں بھی آئے، وہ پہلے سے کتاب خداوندی میں لکھی ہوئی ہے (الحدید ۲۲) اس سلسلہ میں آگے ارشاد ہوا ہے کہ ــــ اور تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسول کی بن دیکھے (ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب، الحدید ۲۵)

احد کا حادثہ اسی قسم کا ایک امتحان تھا۔ مدینہ کے مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک طاقتور ایمان والے، دوسرے کمزور ایمان والے۔ طاقت ور ایمان والے "غیب" کی سطح پر سچائی کو پائے ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کو حق اور ناحق کی روشنی میں دیکھتے تھے نہ کہ ظاہری فتح اور شکست کی روشنی میں۔

کمزور ایمان والے معاملات کو صرف ظاہری سطح پر دیکھنے والی نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اُحد کے حادثہ کے بعد وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کی صداقت پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی روش سے یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اس حق کے ساتھی ہیں جو انھیں ساحل پر مل جائے۔ جس حق کی خاطر دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھانے پڑیں، اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔

اس دنیا میں حق کو "غیب" کی سطح پر پانا پڑتا ہے۔ جو لوگ حق کو "شہود" کی سطح پر پانا چاہیں، وہ حق کو پانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سب سے بڑا ظالم

فمن اظلم ممن کذب علی اللہ وکذب بالصدق اذ جاءہ الیس فی جھنم مثوی للکافرین۔ والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون۔ لھم مایشاءون عند ربھم ذلک جزاء المحسنین۔

(الزمر ۳۲-۳۴)

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ اور سچائی کو جھٹلا دیا جب کہ وہ اس کے پاس آئی۔ کیا ایسے منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا۔ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب ہے جو وہ چاہیں گے۔ یہ بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا۔

اس دنیا میں سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف ہے، اور سب سے بڑا جرم حق کا انکار کرنا ہے۔ آخرت میں جنت اور جہنم کا فیصلہ جس معیار پر ہوگا وہ یہی ہوگا کہ ایک شخص کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کو مانا یا اس کو نظر انداز کر دیا۔ حق کو نظر انداز کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل اعتبار نہیں۔

آدمی کا اصلی اور حقیقی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی خاطر اپنی انا کو توڑا یا نہیں۔ اس نے اللہ کے آگے اپنے عجز کا اقرار کیا یا نہیں۔ حق کا ظہور در اصل اسی امتحان کا لمحہ ہوتا ہے، اس دنیا میں حق کا ظہور چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ کسی انسان کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں حق کے آگے جھکا تو وہ ایک انسان کے سامنے جھکنے کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ احساس اس کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

مگر ایسے مواقع پر جب آدمی جھکتا ہے تو وہ درحقیقت انسان کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ وہ حق کی خاطر جھکا تھا نہ کہ کسی انسان کی خاطر۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

حکمتِ دین

حکمت اور صبر

موجودہ دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے حکمت اور صبر لازمی طور پر ضروری ہیں۔ حکمت اور صبر کے بغیر نہ دین کا کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔

حکمت کی جڑ یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود ظالموں سے نہیں لڑے۔ مگر مدینہ میں حسب ضرورت آپ نے ظالموں کا مقابلہ کیا۔ غزوۂ حمراء الاسد کا سفر باآواز بلند کیا گیا مگر فتح مکہ کے سفر میں آپ نے بلند آوازی سے منع فرمادیا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت آپ نے مکہ والوں کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ مگر بنو بکر اور بنو خزاعہ کا واقعہ پیش آنے کے بعد آپ نے مکہ کے سردار (ابوسفیان) کی تجدید صلح کی پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے منہ میں زبان رکھتے ہوئے چپ ہو جائے۔ کبھی حالات اقدام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں اور کبھی اقدام نہ کرنے کا۔ کبھی آگے بڑھنا افضل ہوتا ہے اور کبھی یہ افضل ہوتا ہے کہ آدمی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کرلے۔ اسی فرق کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی رد عمل سے رکے اور غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں اور سامنے اچانک دوسری گاڑی آگئی۔ اب گاڑی کو روک کر اپنے لیے راستہ نکالنے کا نام صبر ہے، اور رو کے بغیر گاڑی دوڑانے کا نام بے صبری۔

صبر کا طریقہ موجودہ دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جو ڈرائیور بے صبری کے ساتھ سڑک پر گاڑی چلائے وہ خود بھی تباہ ہوگا اور اپنی گاڑی کو بھی تباہ کرے گا۔ اسی طرح جو لوگ صبر کی شرط کو پورا کیے بغیر زندگی میں کامیاب ہونا چاہیں وہ صرف بربادی کی تاریخ بنائیں گے، ترقی اور کامیابی کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

کم پر راضی ہونا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے وہاں طواف اور سعی کیا۔ قربانی کی اور سر منڈایا۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب سے بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ اللہ کی طرف سے عمرہ کی بشارت ہے۔ چنانچہ تقریباً پندرہ سو آدمی سفر کے لیے تیار ہو گیے۔ آپ ان کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

آپ اور آپ کے اصحاب مکہ سے ۹ میل کے فاصلہ پر حدیبیہ پہنچے تھے کہ قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا۔ اور کہا کہ ہم آپ لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہوئی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مع اصحاب مدینہ واپس چلے جائیں۔ البتہ اگلے سال وہ خاموشی کے ساتھ آکر عمرہ کر سکتے ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق آپ نے فیصلہ فرمایا کہ عمرہ نہ کریں اور حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے جائیں تاہم قربانی کے جانور آپ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم طواف اور سعی نہیں کر سکے۔ تاہم قربانی اور حلق ہم کر سکتے ہیں۔ اٹھو، اپنے جانوروں کو ذبح کرو اور سر کے بال منڈالو (قوموا فانحروا ثم احلقوا)

یہ گویا کم پر راضی ہونا تھا۔ اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بنا پر لوگوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوں گے۔ طواف اور سعی کریں گے۔ اور پھر قربانی اور حلق کریں گے۔ مگر جب ایسے حالات سامنے آئے کہ طواف اور سعی بظاہر ناممکن ہو گیا، اور صرف قربانی اور حلق ممکن رہ گیا۔ تو انھوں نے مکہ میں داخلہ اور طواف اور سعی کا ارادہ چھوڑ دیا اور قربانی اور حلق پر راضی ہو گیے۔

یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو کم پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ زیادہ کو پاتا ہے۔ جو شخص پہلے مرحلہ میں کم پر راضی نہ ہو وہ نہ کم کو پاتا اور نہ زیادہ کو۔ اس کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف یہ کہ وہ نزاع چھیڑ کر غیر ضروری طور پر اپنے کو برباد کرتا رہے۔ اور جب برباد ہو کر نزاع کے قابل نہ رہے تو یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دینے کی کوشش کرے کہ میں تو کامیابی کے عین قریب پہنچ گیا تھا مگر دشمنوں کی سازش نے مجھ کو ناکام بنا دیا۔

کم پر راضی ہونا بھی رسول اللہ ؐ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

حکیمانہ تدبیر

مسٹر یوسف خان مئی ۱۹۹۰ میں لندن میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف مسلمانوں نے جو ایجی ٹیشن چلایا اس کو عام طور پر انگریزوں نے بہت ناپسند کیا۔ انگلینڈ میں شاید کوئی ایک بھی انگریز نہیں جو مسلمانوں کے اس ایجی ٹیشن کی وجہ سے ان کا ہم خیال ہو گیا ہو۔ دوسری طرف اسی انگلینڈ (لندن) میں اس کے بالکل برعکس مثال موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کے ٹی وی ادارہ نے ایک خصوصی پروگرام بنایا۔ انھوں نے شہر کے باہر پرسکون مقام پر ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے آٹھ آدمی منتخب کیے۔ ان میں چار مسلم نوجوان تھے جن کا کہنا تھا کہ سلمان رشدی کی کتاب پر بین لگنا چاہیے اور چار غیر مسلم (عیسائی) تھے جو یہ کہتے تھے کہ یہ آزادیٔ تحریر کا معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا ایجی ٹیشن کرنا درست نہیں۔ ان چار غیر مسلموں میں ایک عیسائی کتب فروش بھی تھا جو اپنی دکان پر سلمان رشدی کی کتاب (دی سیٹینک ورسز) کا اسٹاک رکھے ہوئے تھا اور دکان کی بیرونی الماری میں اس کتاب کو ڈسپلے کیے ہوئے تھا۔ مسلمانوں کے مطالبہ کے باوجود وہ اس کتاب کو الماری سے ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ان آٹھ آدمیوں کو مذکورہ مکان میں چار دن تک رکھا گیا۔ وہ وہاں ایک ساتھ کھانا کھاتے اور سنجیدہ انداز میں سلمان رشدی اور اس کی کتاب کے مسئلہ پر گفتگو کرتے۔ ان کے ساتھ ٹی وی کا عملہ بھی موجود تھا جو ان کی تمام سرگرمیوں کو برابر ریکارڈ کرتا رہا۔

آخری دن جب ان سے انٹرویو لیا گیا تو چاروں مخالفین اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ یہ کتاب نہیں چھپنا چاہیے تھی۔ حتی کہ کتب فروش نے صاف لفظوں میں یہ بات کہی کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں مسلمانوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اپنی دکان پر سلمان رشدی کی کتاب کی نمائش نہ کروں :

I have decided not to dispaly *The Satanic Verses* in my shop in deference to the sentiment of the Muslims.

اس دنیا میں ناکامی اور کامیابی دونوں زیادہ تر طریق کار کا معاملہ ہے۔ یہاں غلط طریق کار اختیار کرنے والا آدمی ناکام ہوتا ہے اور صحیح طریق کار اختیار کرنے والا آدمی کامیاب۔

تبدیلی کا اصول

اسلام سے پہلے عرب کے زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایک بار مکہ کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ جھگڑا اس بات پر تھا کہ مکہ کے بڑے مناصب (السقایة، الحجابة، اللواء، الندوة) کس کے پاس رہیں۔ آخر کچھ سنجیدہ لوگوں کی کوشش سے اس پر صلح ہوگئی کہ حجابہ اور لواء اور ندوہ بنو عبدالدار کے پاس رہے۔ اور سقایہ اور رفادہ بنو عبد مناف کو دیدیا جائے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں:

فلم یزالوا علیٰ ذلک حتی جاء اللّٰہ تعالیٰ بالاسلام۔ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ما کانَ من حِلفٍ فی الجاھلیۃ فاِنَّ الاسلامَ لم یزدہُ الّا شدۃً (سیرۃ ابن ہشام، ۱/ ۱۴۴)

وہ لوگ اس پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام بھیجا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو بھی معاہدہ تھا، اسلام نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہے۔

اس سے اسلام کی پالیسی کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے مکہ کے لوگ مشرک تھے۔ ان کا یہ فیصلہ دور شرک کا کیا ہوا فیصلہ تھا جو اسلام کے مسلّمہ دشمن رہ چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نہیں بدلا۔ بلکہ اس کے مزید استحکام کا اعلان فرما دیا۔

مخالف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کے تمام پچھلے فیصلوں کو بدلنا انتہائی غیر حکیمانہ ہے۔ بلکہ یہ سرکشی کا فعل ہے۔ اس طرح کی تبدیلیاں صرف مسائل کو بڑھاتی ہیں۔ سماج میں بدعنوانیوں کے ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے نتیجہ میں اصلاح کے نام پر فساد ظہور میں آتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ غلبہ کے باوجود ماضی کے ڈھانچہ کو باقی رکھا جائے، اور جن چیزوں کو بدلنا ضروری ہو ان کو بھی یک لخت نہ بدلا جائے۔ بلکہ تدریجی رفتار سے فطری انداز میں ان کے اندر تبدیلی لائی جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد بیشتر امور کو علیٰ حالہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے فطری عمل کے تحت اپنے آپ تمام چیزیں اسلامی رنگ میں رنگ گئیں۔

ایک سنّت

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ مفسرین نے اس واقعہ کو معوذتین کی تشریح کے تحت تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک شخص لبید بن اعصم نام کا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک ماہر جادوگر تھا۔ ۷ھ میں خیبر کے کچھ یہودیوں نے اس آدمی کو تین سنہری سکے دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی طاقت ور جادو کرے۔ اس شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال اور آپ کی کنگھی کے کچھ دندانے حاصل کیے۔ اس پر اس نے جادو کا عمل کیا اور اس کو ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں لپیٹ کر بنوزریق کے کنویں کی تہ میں رکھ دیا۔ اس کنویں کا نام ذروان تھا۔ یہ سارا معاملہ اس نے نہایت راز داری کے ساتھ کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر چند دن تک اس جادو کے کچھ اثرات رہے۔ آپ کو اس سے شدید تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ اس کے بعد فرشتہ نے آکر آپ کو پورے معاملہ کی خبر کردی۔ آپ نے مذکورہ کنویں میں سے جادو کا سامان نکلوایا اور اس کو ضائع کردیا۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم کی کہ آپ قرآن کی دو سورہ (معوذتین) پڑھا کریں۔ اس سے آپ اس قسم کے تمام فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فتنہ کا استیصال کرنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اس کا عمومی تذکرہ نہیں کیا۔ کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اگر اس شرارت کو عام مسلمانوں نے جان لیا تو وہ لبید بن اعصم کے ساتھ نہایت برا معاملہ کریں گے۔ راوی کہتے ہیں:

فقلتُ افلا تنشّرتَ۔ فقال اَمّا اللّٰہ فقد شفانی واکرہ ان اُثیر علی احدٍ من الناس شرّاً (اخرجہ البخاری ورواہ مسلم واحمد بمثلہ)

میں نے کہا کہ آپ نے اس کے لیے جھاڑ پھونک کیوں نہ کرائی۔ آپ نے فرمایا کہ جہاں تک جادو کا تعلق ہے تو اللہ نے مجھے اس سے شفا دیدی اور میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں سے کسی شخص کے خلاف شر بھڑکاؤں۔

مومن کی دلچسپی مسئلہ کو ختم کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ مسئلہ پیدا کرنے والے شخص کو بدنام کرنے سے۔

دشمن سے سبق لینا

ہجرت کے پانچویں سال وہ واقعہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوہ خندق کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر قریش اور غطفان کے دس ہزار مسلح لوگ مدینہ کی سرحد پر پہونچ گیے۔ یہ بے حد نازک موقع تھا۔ مسلمانوں میں اس وقت صرف تین ہزار قابل جنگ افراد تھے۔ نیز اسباب کی شدید کمی تھی۔ اس بنا پر مسلمان اس حالت میں نہ تھے کہ قریش کے عظیم لشکر کا کامیاب مقابلہ کر سکیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا کہ ہم فارس کے ملک میں جب گھوڑے کی فوج کے حملہ کا خطرہ محسوس کرتے تھے تو ہم اپنے اور ان کے درمیان خندق کھود دیتے تھے (انا کنا بأرض فارس اذا تخوفنا الخیل خندقنا علینا) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو فوراً مان لیا اور مدینہ کے کنارے خندق کھود کر قریش کی فوج کو شہر کے باہر روک دیا۔

خندق کا لفظ فارسی لفظ کندہ کا معرب ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے خندق کھودی وہ ایران کا بادشاہ منوچہر بن فریدوں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حکمت کی بات مومن کا کھویا ہوا سامان ہے۔ وہ جہاں پائے تو وہ اسی کا ہے (الحکمۃ ضالۃ المومن فاین وجدھا فھو احق بھا) آپ کا حال یہ تھا کہ آپ اگر دشمن کے یہاں بھی کوئی کارگر تدبیر دیکھتے تو اس کو اختیار فرما لیتے۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبر اسلام کی اس سنت کو اپنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ مسلم رہنماؤں کا منفی ذہن ہے۔ وہ اغیار کی سرگرمیوں کو صرف "سازش" کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ ان کو "تدبیر" کے روپ میں نہیں دیکھ پاتے۔ ان کے اس بگڑے ہوئے مزاج نے ان کے اندر سے یہ صلاحیت ختم کر دی ہے کہ وہ کھلے ذہن کے تحت غیر قوموں کی کارروائیوں کا مطالعہ کریں اور ان سے سبق لے کر ان کے کارگر طریقوں کو استعمال کریں۔

کامیاب وہ ہے جو دشمن کی سازشوں کو ان کے سازشی پہلو سے الگ کر کے خالص تدبیری پہلو سے دیکھے۔ اغیار کی کارروائیوں کو بھی وہ اپنے لیے مفید بنالے۔

پہلا اسکول

علم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گیے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ان کے اساتذہ زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ مسلمانوں کے رہنماؤں نے کہا کہ یہ غیر مسلم استاد ہمارے بچوں کو خراب کر دیں گے، اس لیے ان اداروں میں مسلمانوں کو داخل کرنا درست نہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہو گیے۔

یہ مصلحت درست نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو سب سے پہلا اسکول کھولا گیا، اس کے تمام استاد غیر مسلم تھے۔ یہ اسکول مدینہ میں مشرک قیدیوں کے ذریعہ کھولا گیا۔ بعض لوگ صفہ کو پہلا اسلامی مدرسہ کہتے ہیں۔ مگر صفہ تربیت گاہ تھا نہ کہ تعلیم گاہ۔ اسلام کی پہلی تعلیم گاہ یقیناً وہ ہے جو غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ذریعہ مدینہ میں قائم کی گئی اور اس کے ٹیچر سب کے سب مشرک اور غیر مسلم تھے۔

حتی کہ اس تعلیمی نظام کی بنا پر مدینہ میں مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ وہ انصار کے لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس کے بعد ایک روز ایک لڑکا روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے پوچھا تمہارا حال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے معلّم نے مجھ کو مارا ہے۔

(جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداءهم أن یعلّموا اولاد الانصار الکتابة۔ فجاء غلام یوماً یبکی الی امّه فقالت ماشانك۔ فقال ضربنی مُعلّمی (سیرۃ ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۵۱۲)

یہ قیدی سب کے سب اسلام کے دشمن تھے۔ ان کو چھوڑنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف مسئلہ بنیں گے۔ اس کے باوجود انھیں تعلیم کی قیمت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے اسے حاصل کرنا چاہیے۔

ناقابلِ تسخیر طاقت

ابن خلدون (۱۴۰۶-۱۳۳۲ء) کی زندگی کا ایک حصہ شام میں گزرا۔ ۱۴۰۰ء میں جب کہ تیمور نے وحشی تاتاری قبائل کے ساتھ دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ابن خلدون اس وقت دمشق ہی میں تھا۔ محاصرہ کے دوران تیمور اور دمشق کے باشندوں میں بات چیت شروع ہوئی۔ اس وقت تیمور نے ابن خلدون سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جو تاریخ داں کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ دمشق کے باشندوں نے یہ سمجھا کہ تیمور صلح پر آمادہ ہے۔ چنانچہ ابن خلدون کو رسیوں میں باندھ کر شہر پناہ کی دیوار سے باہر کی طرف لٹکایا گیا۔ اس طرح وہ تیمور کے کیمپ میں پہونچا۔ ابن خلدون سات ہفتہ تک تیمور کے کیمپ میں رہا۔ تیمور نے ابن خلدون کی کافی عزت کی۔ اس نے ابن خلدون کی خواہش کے مطابق اس کے لیے بحفاظت مصر جانے کا انتظام کر دیا۔ وغیرہ۔

تاہم اس عزت افزائی کے پیچھے تیمور کا خود اپنا مفاد تھا۔ بظاہر مزید فتوحات کا خواب دیکھتے ہوئے، تیمور نے ابن خلدون سے شمالی افریقہ کا تفصیلی نقشہ دریافت کیا۔ اس موضوع پر اس نے نہ صرف ابن خلدون کی گفت گو سنی، بلکہ اس سے ایک جامع تحریری رپورٹ بھی حاصل کی:

> Probably dreaming of further conquests, Timur asked for a detailed description of North Africa and got not only a short lecture on that subject, but also an extensive written report. (9/149)

تیمور اگرچہ اہلِ دمشق کے لیے اتنا سفاک تھا کہ صلح کی پیش کش کے باوجود اس نے دمشق کو تباہ کر دیا اور وہاں کی عظیم مسجد کو نذرِ آتش کر دیا۔ مگر شخصی سطح پر اس نے ابن خلدون کی پوری قدردانی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن خلدون نے اپنے ممتاز جغرافی اور تاریخی علم کی بنا پر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ تیمور کے لیے نہایت مفید رہنما بن سکتا ہے۔

آدمی اگر اپنی افادیت ثابت کر دے تو وہ ہر ایک کی نظر میں محترم بن جاتا ہے، حتی کہ سفاک دشمن کی نظر میں بھی۔ افادیت اور نفع بخشی ایسی چیز ہے جو خوں خوار لوگوں کو بھی مہربان بنا دے، جو بادشاہوں کو بھی آدمی کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے۔

لشکر کا کام خط سے

یزید کے زمانہ میں عراق کا گورنر ابن زیاد تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کا ایک بدنام شخص ہے۔ تاہم اس کے ایک واقعہ میں بڑی نصیحت ہے۔

اس کے زمانہ میں بعض سرحدی علاقوں میں بغاوت ہوگئی۔ اس کے درباریوں نے کہا کہ ہم کو فوراً لشکر بھیجنا چاہئے ورنہ باغی ہتھیار نہ رکھیں گے۔ ابن زیاد نے کہا کہ لشکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ایک خط بھیجتے ہیں اور وہ خط ہی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا۔ اس موقع پر اس نے جو جملہ کہا تھا وہ عربی زبان میں اس مفہوم کے لئے ضرب المثل بن گیا ہے۔ اس نے کہا :

کتابٌ ینوبُ عن کتائب ایک خط لشکر کا قائم مقام ہے

اس کے بعد ابن زیاد نے ایک دھمکی کا خط باغیوں کے نام روانہ کیا اور خط پاتے ہی انھوں نے گھبرا کر اپنی بغاوت ختم کر دی۔

ابوفراس حمدانی نے عباسی خلیفہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں وہ اسی قسم کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

اذا ما أرسلَ الامراء جیشا الی الاعداء ارسلنا الکتابا

دوسرے امراء جہاں اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے لشکر بھیجتے ہیں وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں

یہی گہری سیاست کا راز ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ جہاں کوئی حریف نظر آئے اس سے براہ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ یہ بیوقوفوں کی سیاست ہے جس کے نتیجہ میں خون خرابہ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ عقل مند آدمی کی سیاست ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کے نام ایک وارننگ لکھ کر بھیج دینا کافی ہو۔ لڑے بھڑے بغیر محض دھمکی سے معاملہ ختم ہو جائے۔

دشمن کے خلاف طاقت کا استعمال ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ دشمن کی طاقت کو اپنے خلاف استعمال کئے جانے کا خطرہ مول لیا جائے۔ دوطرفہ استعمال طاقت کے بعد فاتح کو بھی کھنڈر کے اوپر اپنا جشن فتح منانا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی لڑنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ سب سے بُری فتح وہ ہے جو لڑ کر حاصل ہو اور سب سے اچھی فتح وہ ہے جو لڑے بغیر آدمی کے حصہ میں آجائے۔

اتّحاد و اتفاق

تفریق کا سبب

اختلافات ہمیشہ چھوٹے مسائل میں ہوتے ہیں نہ کہ بڑے بڑے مسائل میں۔ مثلاً "محمد بن عبد اللہ پیغمبر تھے" اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ عقیدہ تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ مگر آپ پر درود کیسے بھیجا جائے، اس میں جزئی اختلافات پیدا ہو گئے۔ مثلاً سنی حضرات آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شیعہ حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپ کے نام کے آگے صلی اللہ علیہ وآلہ کا لفظ شامل کرتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً تمام مسلمان اس کو مانتے ہیں کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملے تو وہ سلام اور مصافحہ کرے۔ مگر یہاں یہ اختلاف ہے کہ حنفی لوگ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور اہل حدیث حضرات ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔

شریعت میں اس طرح کے اختلافات کا پیدا ہونا بذات خود نہ غلط ہے اور نہ مضر بلکہ اس طرح کے اختلافات ایک طبیعی امر ہیں اور ہر گروہ میں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اصل غلطی یہ ہے کہ لوگ موشگافیاں کر کے یہ ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کا طریقہ افضل ہے اور دوسرے کا طریقہ غیر افضل ان کا طریقہ راجح ہے اور دوسرے کا طریقہ مرجوح۔ بس یہیں سے خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ غیر ضروری بحثیں کرنے لگتے ہیں اور انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ـــــ یہ بھی درست ہے اور وہ بھی درست ہے۔ آدمی جس طریقہ کو چاہے اختیار کرے اور اسی کے ساتھ دوسرے کو دوسرے طریقہ پر چلنے دے۔

اس طرح کے ضمنی امور میں راجح اور مرجوح ، افضل اور غیر افضل کی بحث چھیڑنا سخت مضر ہے۔ ایسی بحث ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ بنیادی چیزوں سے نظریں ہٹ جائیں اور غیر بنیادی چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جائیں اور نتیجہ میں امت مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جائے۔

اساسی اور بنیادی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اتحاد ہے اور جزئی اور ضمنی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اختلاف۔

اختلاف نہیں

سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور سب سے بڑی کمزوری اختلاف۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر قیمت پر اتحاد کو باقی رکھنے کا حکم ہے، خواہ اس کی خاطر کسی دوسری بڑی چیز کو قربان کر دینا پڑے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نجات پانے کے بعد چالیس دن کے لئے کوہ طور پر گئے۔ اس درمیان میں سامری نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں بتلا کر دیا۔ یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو کافی سمجھایا مگر وہ نہ رکے۔ جب حضرت موسیٰ کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کو شرک میں بتلا دیکھا تو قرآن کے بیان کے مطابق، انھوں نے حضرت ہارون سے سخت بازپرس کی۔ انھوں نے کہا کہ اے ہارون، جب تم نے دیکھا کہ قوم کے لوگ بہک گئے ہیں تو تم کو ان کی اصلاح سے کس چیز نے روکا۔ کیا تم میرے راستہ سے ہٹ گئے۔ حضرت ہارون نے کہا، اے میرے بھائی، میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑئیے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ مگر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا (طٰہٰ ۹۳ - ۹۲)

حضرت موسیٰ کے پیچھے حضرت ہارون بنی اسرائیل کے نگراں تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل ایک شخص کے فریب میں آکر شرک کر رہے ہیں تو انھوں نے زبانی نصیحت کی حد تک انھیں روکنے کی پوری کوشش کی مگر وہ نہ رکے۔ حضرت ہارون، جو شریک نبوت تھے، انھوں نے حضرت موسیٰ کو جواب دیا کہ اگر میں زبانی نصیحت سے آگے بڑھ کر عملی مقابلہ کی حد تک جاتا تو مجھے ڈر تھا کہ برائی تو ختم نہ ہوگی البتہ بنی اسرائیل دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ میرا ساتھ دیں گے اور کچھ سامری کا۔ اور پھر دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ اس پھوٹ سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا کہ برائی کے خلاف عملی اقدام نہ کر کے اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب کہ آپ واپس آئیں اور پھوٹ کا خطرہ مول لئے بغیر مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے اس عذر کو تسلیم کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے درمیان باہمی تفریق اتنی بری ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر بڑی سے بڑی چیز بھی گوارا کی جا سکتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہر دوسری چیز کی اہمیت اتحاد کے بعد ہے۔ ہر اہم چیز اس وقت غیر اہم بن جاتی ہے جب کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے اتحاد و اتفاق کی قیمت دینی پڑے۔

مومنانہ طریقہ

ابن عبدالبر اندلسی (م ۴۶۳ھ) نے ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

رویـنا ان طاؤسا ووهب بن منبه التقیا۔ فـقال طاؤس لوهب یا اباعبدالله، بلغنی عنك امرعظیم۔ فـقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم علی بعض۔ قال اعوذبالله۔ ثم سکتا۔ قال فقلت هل اختصما، قال لا۔
(جامع بیان العلم وفضلہ، الجزء الثانی، صفحہ ۹۵)

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ طاؤس اور وہب بن منبہ ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا کہ اے ابوعبداللہ، آپ کے بارہ میں مجھے ایک سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا طاؤس نے کہا یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض کو بعض کے اوپر چڑھایا۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہوگیے۔ میں نے راوی سے پوچھا، کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ راوی نے جواب دیا کہ نہیں۔

سوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک سچا سوال، دوسرے جھوٹا سوال۔ سچا سوال کرنے والا واقعی سائل ہوتا ہے۔ وہ ایک بات کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کو چپ کرنا آسان ہے۔ اس کو اپنے سوال کا جواب مطلوب تھا، اور جب اس کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تو وہ خاموش ہوگیا۔

جھوٹے سائل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا مقصد حقیقت کو جاننا نہیں ہوتا بلکہ شخصِ ثانی کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے سوال کا جواب پاکر چپ ہوجائے تو اس کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہر جواب کے بعد نئے شوشے نکال لیتا ہے ——— کبھی غیر متعلق باتیں چھیڑتا ہے۔ کبھی دلیل سے ہٹ کر عیب جوئی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی تلخ کلامی سے مخاطب کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ کبھی دھاندلی اور تمسخر کا انداز اختیار کرتا ہے۔

جو لوگ اس طرح دوسرے کو غلط ثابت کرنا چاہیں، وہ خود اپنے آپ کو غلط ثابت کرتے ہیں نہ کہ کسی دوسرے شخص کو۔

عبرت ناک

مسلمان اسپین میں ۹۲ ھ میں داخل ہوئے اور وہاں حکومت قائم کی۔ آٹھ سو سال تک با اقتدار رہنے کے بعد ۸۹۷ ھ میں وہاں سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لمبی مدت کا بڑا حصہ عیسائی طاقتوں سے لڑنے میں گزرا۔ آخری دور میں مسلمانوں کی حکومت غرناطہ کے محدود علاقہ میں رہ گئی تھی اور اسپین کے وسیع حصہ پر فرڈینینڈ دوم (۱۵۱۶–۱۴۵۲) کی حکومت قائم تھی۔

۸۷۰ ھ میں سلطان ابوالحسن غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سلطنت غرناطہ کا رقبہ کم ہو کر صرف چار ہزار مربع میل باقی رہ گیا تھا۔ جب کہ شاہ فرڈینینڈ کی حکومت کا رقبہ تقریباً سوا لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ فرڈینینڈ نے مطالبہ کیا کہ سلطان ابوالحسن اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر آدمی تھا۔ اس نے عیسائی بادشاہ کو جواب میں لکھا کہ: "غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے چاندی کے سکّے ڈھالنے کے بجائے لوہے کی تلواریں تیار ہو رہی ہیں تاکہ تم عیسائیوں کی گردنیں ماری جائیں"۔ اس کے بعد دونوں بادشاہوں میں جنگ چھڑ گئی۔ سلطان ابوالحسن نے ان جنگوں میں بار بار شاہ فرڈینینڈ کو شکست دی۔ تاہم آخری فتح فرڈینینڈ کو ہوئی۔

اس کا سب سے بڑا سبب خود سلطان ابوالحسن کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تھا۔ ۲۷ جمادی الاول ۸۸۷ ھ کو لوشا کے میدان میں سلطان ابوالحسن نے فرڈینینڈ کی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ مگر جب وہ دشمن کو شکست دے کر واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے ابوعبداللہ محمد نے غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد سلطان اور باغی شہزادے میں جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء (۸۹۷ ھ) کو عیسائی بادشاہ نے آخری طور پر سلطنت غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کو ماضی میں جتنی شکستیں ہوئی ہیں، سب آپس کے اختلافات کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا یہی وہ سب سے بڑا واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے کم معلوم ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی وہ اسی طرح آپس میں لڑ رہے ہیں جیسے کہ انھوں نے اپنے ماضی سے کچھ سبق نہیں سیکھا۔

اتحاد کی اہمیت

حضرت ابوسعید خُدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو ہو تو اپنی صفوں کو درست کرو اور خلل کو اچھی طرح پُر کر لو (اذا قمتم فاعدلوا صفوفکم وسدوا الفرُج)

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ جس شخص نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے اور جس شخص نے صف کو کاٹا اللہ اسے کاٹ دے (من وصل صفاً وصله الله ومن قطع صفاً قطعه الله)

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں اپنی صفوں کو اچھی طرح پر کرو اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ گردنوں کو برابر رکھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ صفوں کے خلل سے بکری کے بچہ کی طرح داخل ہو رہا ہے (رُصُّوا صفوفکم وقاربوا بینها وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیده انی لأرى الشیطان یدخل من خلل الصف کانها الحذف) ابو داؤد، نسائی

اس طرح کی بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جن میں یہ تاکید ہے کہ جب نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہو تو خوب مل کر صف بندی کرو۔ کچھ روایتوں میں یہ بھی ہے کہ دو نمازیوں کے بیچ میں اگر خلل رہے گا تو وہاں سے شیطان داخل ہو جائے گا۔ کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنوں میں لے لیا۔ حالاں کہ اگر اس کو بالکل لفظی معنوں میں لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قابل عمل ہی نہیں۔ کیوں کہ دو نمازی جب اپنے پیروں کو پھیلا کر ایک دوسرے سے ملاتے ہیں تو خود ایک نمازی کے اپنے دو پیروں کے درمیان اتنا خلل ہو جاتا ہے جو "بکری کے بچہ" کے داخل ہونے کے لیے کافی ہو۔

ان روایتوں میں ایک حقیقت پر زور دینا مقصود ہے نہ کہ محض ایک ظاہری شکل پر۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پوری زندگی میں متحد ہو کر رہنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تمام سرگرمیوں کو اتحاد کے ساتھ انجام دیں۔ ان کے ہر عمل میں اتحاد کے جذبہ کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ چند مسلمان اگر سفر کریں تو وہ بھی اپنا ایک امیر بنالیں اور متحدہ صورت میں سفر کریں۔ مسلمان جہاں بھی باہمی اتحاد میں کمی کریں گے وہیں شیطان ان کی صفوں کے اندر گھس جائے گا اور ان کے تمام مقاصد کو برباد کر دے گا۔ آپس کے تعلقات میں اگر دوری پیدا ہو جائے تو نہ مسجد کے اندر کی دنیا فتنوں سے خالی رہے گی اور نہ مسجد کے باہر کی دنیا۔

اختلاف کا سبب دنیا

ہر قسم کے جھگڑوں کے پیدا ہونے کا واحد سبب دنیا کو اہمیت دینا ہے۔ لوگ اگر آخرت کو اہمیت دینے لگیں تو کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو فوراً ختم ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ یہ بے حد اختلافی مسئلہ تھا۔ مہاجرین کا خیال تھا کہ امیر کسی مہاجر کو ہونا چاہئے۔ انصار کہتے تھے کہ انصار میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔ اس کے بعد ذی ہوش افراد نے لوگوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخر وقت میں حضرت ابو بکر کو نماز کا امام بنایا تھا۔ نماز کی امامت انتظام دین کا معاملہ ہے، اور امارت اور خلافت انتظام دنیا کا معاملہ۔ پھر اللہ کے رسول نے جس شخص کو انتظام دین کے لئے اہل سمجھا ہو وہ بدرجۂ اولیٰ انتظام دنیا کا اہل ہوگا۔

اس سلسلے میں یہاں دو روایتیں نقل جاتی ہیں:

اخرج النسائی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت الانصار منا امیر ومنکم امیر فاتاھم عمر رضی اللہ عنہ فقال الستم تعلمون ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد امر ابابکر ان یصلی بالناس فایکم تطیب نفسہ ان یتقدم ابابکر۔ فقالوا نعوذ باللہ ان نتقدم ابابکر (جمع الفوائد)

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے ہو۔ تو حضرت عمر ان کے پاس آئے اور کہا کہ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پھر تم میں سے کون یہ پسند کرے گا کہ وہ ابو بکر کے آگے بڑھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم ابو بکر کے آگے بڑھیں۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال لقد امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابابکر ان یصلی بالناس وانی لشاھد وما انا غائب ومابی مرض فرضینا لدنیانا مارضی بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا (کنز العمال)

حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں اس وقت موجود تھا میں غائب نہیں تھا۔ مجھے کوئی بیماری بھی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم اپنی دنیا کے لئے اس شخص پر راضی ہیں جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کے لئے راضی ہوگئے تھے۔

مشورہ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المستشار مؤتمن

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔

عن ابی ھریرہ قال مارأیت احداً اکثر مشورۃ لاصحابہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی، فضائل الجہاد)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اتنا زیادہ مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے۔

قال جعفر الصادق رضی اللہ عنہ لسفیان الثوری شاور فی امرك الذین یخشون اللہ تعالیٰ۔ (تعلیم المتعلم للشیخ الزرنوجی)

امام جعفر صادق نے سفیان ثوری سے کہا: اپنے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

قال علی کرم اللہ وجہہ ماھلك امرؤ عن مشورۃ۔ (تعلیم المتعلم)

حضرت علی کا قول ہے کہ مشورہ سے کوئی انسان کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔

عن ابن عباس من اراد امراً فشاور فیہ امرءً مسلما وفقہ اللہ تعالیٰ لارشد امورہ ماتشاور قوم قط الاھدوا لارشد امرھم (مدارک التنزیل)

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جو شخص کوئی کام کرنا چاہے پھر کسی مرد مسلم سے مشورہ کرے تو اللہ تعالیٰ کام کے بہتر پہلو کی طرف اس کی رہنمائی کر دیتا ہے جو لوگ بھی مشورہ کی پابندی کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے معاملہ کے زیادہ درست پہلو کو پا لیتے ہیں۔

من اشار علی اخیہ بشیئ یعلم الرشد فی غیرہ فقد خان۔ (تفسیر ابن جریر)

جس نے اپنے بھائی کو جان بوجھ کر غلط مشورہ دیا اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔

آدمیوں میں کوئی زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور کوئی کم سمجھ والا۔ کسی کے سامنے ایک پہلو ہوتا ہے۔ اور کسی کے سامنے دوسرا پہلو۔ کوئی متاثر رائے قائم کرتا ہے اور کوئی غیر متاثر رائے۔ ایسی حالت میں آدمی کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ دوسروں سے مشورہ کر لیا جائے تاکہ مختلف رایوں کے سامنے آنے کے بعد صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ مشورہ گویا کہ دوسروں کی صلاحیتوں کے ذریعہ اپنی کمیوں کی تلافی ہے۔

تنقید و اختلاف

ابن قیم الجوزیہ ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ۷۵۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی ایک مشہور کتاب اعلام الموقعین ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان ۱۰۰ مسائل میں باہم اختلاف تھا۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے صحابہ کے درمیان رایوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

ولم یستنکر احد ھذا الخلاف۔ انما اعتبرہ الجمیع امرا طبیعیا لا یقطع وُدّاً ولا یفرق صفاً۔

اور کسی نے بھی اس اختلاف کو برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا۔ جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوتا۔

یہ اسلام کی وہ صورت حال ہے جو اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں تھی۔ یعنی وہ زمانہ جس کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان آزادانہ طور پر اختلاف رائے کرتا تھا۔ یہ اختلافِ رائے اکثر نہایت شدید الفاظ میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اختلاف اور تنقید کرنے والے کو روکا جائے یا اس کو کوئی ناپسندیدہ کام سمجھا جائے۔

اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ آج اگر کسی مسلم شخصیت پر تنقید کردی جائے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ ناقد کو برداشت کرنے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دورِ صحابہ اور موجودہ زمانہ میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ صرف ایک اللہ کو بڑا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ کے بعد تمام انسان ان کی نظر میں برابر تھے۔ اس لیے انسانوں پر تنقید سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی بڑا بنائے ہوئے ہیں۔ ان انسانی بڑوں کے لیے انھوں نے مبتدعانہ طور پر "اکابر" کا لفظ وضع کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

دین میں معیار بہر حال اصحاب رسول ہیں۔ مسلمان اگر اس کے سوا کوئی اور معیار بنائیں تو وہ بلا شبہ بدعت ہے، اور بدعت اسلام میں مقبول نہیں۔

ایک آیت

وَاِنْ خِفْتُم شقاقَ بینهما فَابْعثوا حکمًا من اهله وحکمًا من اهلها ان یریدا اصلاحًا یوفق اللہ بینهما ان اللہ کان علیمًا خبیرًا

النساء ۳۵

اور اگر تم کو دونوں کے درمیان بگاڑ کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے اہل میں سے اور ایک منصف عورت کے اہل میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا محمود حسن صاحبؒ لکھتے ہیں "یعنی اے مسلمانو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور عورت میں مخالفت اور ضد ہے۔ وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے تو تم کو چاہیے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے۔ اور جس کا جتنا قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔ اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرا دے گا۔"

جب بھی دو مسلمانوں میں نزاع کی کوئی صورت پیدا ہو تو وہ قرآن کے اس حکم کے تحت آجائے گا۔ اور عام مسلمانوں پر لازم ہو جائے گا کہ اس طریقہ کو اختیار کر کے مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو ختم کریں۔ تاہم اس قرآنی حکم کی برکت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ فریقین اپنے ذاتی اصرار کو چھوڑ کر خدائی فیصلہ کے آگے جھکنے پر راضی ہوں۔ حضرت علیؓ کے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کا جھگڑا لایا گیا۔ آپ نے دونوں طرف سے ایک ایک حکم مقرر فرمایا۔ عورت نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مرد نے کہا کہ اگر تفریق کا فیصلہ ہوا تو وہ مجھے قبول نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تجھ کو اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر راضی ہونا پڑے گا، خواہ وہ تمہارے موافق ہو یا تمہارے خلاف۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۹۳)

اختلاف کے باوجود

ابوالبرکات علوی صاحب (پیدائش ۱۹۲۹) اعظم گڈھ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ نومبر ۱۹۴۶ میں دیوبند گیے تھے۔ وہاں وہ چند روز مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) کے مہمان رہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ کانگریسی مسلمانوں اور مسلم لیگ کے لوگوں کے درمیان اختلاف اپنے آخری عروج پر تھا۔ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے پرجوش مسلمان مولانا حسین احمد مدنی کے سخت ترین مخالف تھے۔ مولانا مدنی کے خلاف جھوٹے الزام لگانا، ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرنا، ان کے دینی وقار کو مجروح کرنا، غرض ان کے خلاف ہر نازیبا حرکت کو انھوں نے اپنے لیے جائز کرلیا تھا۔

نفرت اور اشتعال کی یہی فضا تھی جب کہ ابوالبرکات علوی نے دیوبند کا سفر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز جب کہ وہ مولانا مدنی کے مہمان خانہ میں تھے۔ انا اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک شخص آیا۔ بظاہر وہ مولانا مدنی کے مریدوں میں سے تھا۔ اس نے کہا: مولانا، قائدِ اعظم مسٹر جناح کا اللہ کے یہاں کیا حشر ہوگا۔

ابوالبرکات علوی کا بیان ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے۔ اس کے بعد سنجیدہ انداز میں فرمایا: اگر اس کے ارادے نیک ہیں تو اس کا اجر بھی نیک ہوگا۔ اور اگر اس کے ارادے نیک نہیں ہیں تو اس کا اجر بھی نیک نہیں ہوگا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ سخت ترین شکایت اور اختلاف کی حالت میں بھی مومن کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے ہر قول اور فعل کا اس سے حساب لینے والا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک حد پر قائم رہے، وہ ہر حال میں انصاف کی بات کہے۔

مولانا حسین احمد مدنی مسٹر جناح کے سخت مخالف تھے۔ دونوں کے درمیان تعلقات اشتعال انگیزی کی حد تک خراب ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب مولانا کو مسٹر جناح کے بارہ میں بولنا ہوا تو وہ عبدیت کے دائرہ میں رہ کر بولے۔ اپنے قابل نفرت دشمن کے بارہ میں بھی وہ انصاف کی حد سے باہر نہ جا سکے۔

زیادہ بڑی برائی

ایک صاحب اپنی بستی کی مسجد کے امام کے خلاف زبردست مہم چلائے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ امام بدعتی ہے، اس لیے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ وہ صاحب اپنی تمام کوشش کے باوجود امام کو مسجد سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے جو ہوا وہ صرف یہ تھا کہ بستی کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بستی میں مسجد کی رحمتیں اور برکتیں تو نہیں پھیلیں، البتہ پوری بستی نفرت اور اختلاف اور تشدد کا اکھاڑا بن گئی۔ ایک مثبت عمل منفی نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ یہ مسئلہ کیوں کھڑا کیے ہوئے ہیں کہ امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ صلوا خلف کل بر وفاجر (ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھو) میں نے کہا کہ امامت تنظیم کے لیے ہوتی ہے۔ ورنہ نماز کا تعلق آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ جیسی آپ کی نیت ہوگی ویسی آپ کی نماز ہوگی۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے اخلاص کو ٹٹولیں نہ کہ امام کی برائیوں کو۔

انھوں نے کہا کہ آپ عالم ہو کر غلط مسئلہ بتا رہے ہیں۔ جو حدیث آپ نے بتائی، اس میں فاجر کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت ہے، مگر بدعتی کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ کیونکہ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسری حدیث میں ہے کہ لا تصلوا خلف محدث (بدعتی شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھو)

میں نے کہا کہ کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے الفاظ جاننا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ تفقہ بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری روایت میں محدث (بدعتی) کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ انتخاب (choice) محدث اور متبع سنت کے درمیان ہو۔ مگر آپ کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ کے لیے محدث اور متبع سنت کے درمیان انتخاب کا موقع نہ تھا، بلکہ آپ کو محدث امام اور مسلمانوں کے باہمی جدال وقتال کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ اور جب حالات کی نوعیت یہ ہو تو محدث امام کو برداشت کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کو باہمی اختلاف کے شدید تر فتنہ سے بچایا جا سکے۔

اسلام ایک نتیجہ رخی (result oriented) مذہب ہے۔ اسلام میں آخری حد تک نتیجہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں صرف وہی اقدام جائز ہے جو بہتر نتیجہ تک پہنچانے والا ہو۔ بہتر نتیجہ پیدا کرنے والا اقدام جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ برا نتیجہ پیدا کرنے والے اقدام سے اپنے آپ کو باز رکھا جائے۔

اسوۂ حسنہ

خدا اور رسول کا طریقہ

غزوۂ تبوک (۹ھ) کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ سفر کے دوران ایک مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہوگئی۔ آپ کے اصحاب اس کی تلاش میں نکلے۔ ایک مسلمان (منافق) بھی شریک سفر تھا جس کا نام زید بن اللُّصیت تھا۔ اس نے اصحاب رسول کو اِدھر اُدھر جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ کیا بات ہے۔ ایک صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ؐ کی اونٹنی گم ہوگئی ہے، اس کو ہم تلاش کر رہے ہیں۔ اس پر زید بن اللُّصیت نے طنز کرتے ہوئے کہا:

أليس محمد يزعم انه نبي ويخبركم عن خبر السماء وهو لا يدري أين ناقته (سیرۃ ابن ہشام ۴/۱۷۸)	کیا محمد کا اپنے بارہ میں یہ گمان نہیں ہے کہ وہ نبی ہیں اور وہ تم لوگوں کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا ہے کہ یہ محمد تم کو خبر دیتے ہیں کہ وہ نبی ہیں اور ان کا گمان ہے کہ وہ تم کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں، حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے۔ میرا حال خدا کی قسم یہ ہے کہ مجھے اس کے سوا کسی چیز کا علم نہیں جو اللہ نے مجھ کو بتا دیا ہے۔ اور اب اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ اونٹنی کہاں ہے۔ وہ اس وادی میں فلاں گھاٹی میں ہے۔ ایک درخت میں مہار کی رسی الجھنے نے اس کو روک لیا ہے۔ تم لوگ وہاں جاؤ اور اس کو لے کر میرے پاس آؤ۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد زید بن اللُّصیت نے توبہ کرلی۔ دوسرا قول یہ ہے وہ برابر اپنے اس شر میں مبتلا رہا یہاں تک کہ وہ مرگیا (۴/۱۷۸)

اس واقعہ کے بعد ایک صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آتا کہ زید بن اللُّصیت شتم رسول کا مجرم ہے، اس کو فوراً قتل کردو۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے صرف یہ بتانے پر اکتفا فرمایا کہ اونٹنی فلاں جگہ موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر زید کو قتل کرواتے تو وہ صرف ایک شخص کا قتل ہوتا، مگر جب آپ نے کھوئی ہوئی اونٹنی کی بابت صحیح صحیح خبر دیدی تو آپ نے اس کے فتنہ کو قتل کر دیا، اور بلاشبہ کسی شخص کو قتل کرنے کے مقابلہ میں اس کے فتنہ کو قتل کرنا کہیں زیادہ اہم ہے اور اسی کے ساتھ کہیں زیادہ مفید بھی۔

بلند اخلاق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن کی گواہی ہے کہ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر تھے (القلم ۴) آپ کے اعلیٰ اخلاق کا ایک واقعہ یہ ہے:

عن انس بن مالك، قال كنت امشي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليه بُردٌ نجرانيٌّ غليظُ الحاشية فادركه اعرابيٌّ فجبذه بردائه جبذةً شديدةً فنظرت الى صفحة عاتق النبي صلى الله عليه وسلم وقد اثّرت بها حاشية البرد من شدة جبذته ثم قال يا محمّد مُرْ لي من مال الله الذي عندك فالتفت اليه فضحك ثم امر له بعطاء (متفق عليه)

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپ کے اوپر موٹے کنارے کی نجرانی چادر تھی۔ ایک دیہاتی آپ سے ملا۔ اس نے آپ کی چادر پکڑ کر آپ کو نہایت زور کے ساتھ کھینچا۔ میں نے دیکھا تو سختی کے ساتھ چادر کھینچنے کی وجہ سے آپ کے کندھے پر نشان پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد دیہاتی نے کہا کہ اے محمد، مجھے اس مال میں سے دینے کا حکم دو جو تمہارے پاس ہے۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ پھر آپ نے اس کو مال دیئے جانے کا حکم فرمایا۔

مذکورہ دیہاتی ایک اعتبار سے گستاخ تھا، دوسرے اعتبار سے وہ ضرورت مند تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے گستاخی کے پہلو کو نظر انداز کیا اور صرف اس کی ضرورت کے پہلو کو دیکھا۔ اس کی گستاخی کا جواب آپ نے مسکراہٹ سے دیا اور اس کے ضرورت مند ہونے کی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو مال عطا فرمایا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں مومن کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ذاتی رنج کے پہلو کو نظر انداز کرے اور معاملہ کے حقیقی پہلو پر توجہ دیتے ہوئے اس کو خیر خواہانہ اور منصفانہ انداز میں حل کرنے کی کوشش کرے۔

کسی شخص سے مومن کو تکلیف پہونچے تو وہ ذاتی تکلیف کے پہلو کو خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ ذاتیات سے اوپر اٹھ کر ایسے شخص سے معاملہ کرتا ہے۔

حق دار کا حق

عن ابی ھریرۃَ ، اَنَّ رجُلاً اتی النبیَّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یَتَقَاضَاہُ فاغلظ لہٗ فہَمَّ بہ اصحابُہٗ فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم دَعُوہُ فانّ لصاحبِ الحقّ مقالاً (متفق علیہ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے (اپنے قرض کا) تقاضا کیا اور سخت کلامی کی۔ آپ کے اصحاب نے اس کو تنبیہہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ حقدار کو بولنے کا حق ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ ایک اہم اخلاقی اصول کو بتا رہا ہے جس کے ذریعہ سے اجتماعی زندگی کو خوش گوار بنایا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ کے اوپر کسی شخص کا کوئی حق ہو، کسی کو آپ سے شکایت ہو جائے، کوئی شخص کسی معاملہ میں آپ سے تلخ کلامی کر بیٹھے تو اس کے برے رویہ کو نظر انداز کر کے اس کا حق ادا کیجئے۔

معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق جائز یا ناجائز طور پر قابل اعتراض الفاظ بولتا ہے۔ وہ اشتعال دلانے والی زبان استعمال کرتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر اس کی سخت کلامی سے الجھا جائے تو بات بڑھتی چلی جائے گی۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے قابل شکایت رویہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

حق دار کو شکایت کا حق ہے، حتی کہ اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنی شکایت کو نامناسب الفاظ میں پیش کرے۔ ایسے مواقع پر فریق ثانی کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس ساری توجہ اس پر لگانا چاہیے کہ میرے اوپر اس کا ایک حق ہے اور مجھ کو چاہیے کہ میں اس کا حق اس کو ادا کر دوں۔

مومن کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ جب دوسرے شخص سے پڑتا ہے تو وہ دوسرے کے حصہ کی غلطیوں کو نہیں دیکھتا، اس کا سارا دھیان اپنے حصہ کی کمیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا مزاج مسئلہ کو ختم کرنے کا ہوتا ہے نہ کہ مسئلہ سے الجھنے کا۔ جو آدمی مسئلہ کو ختم کرنا چاہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو دیکھے گا، کیوں کہ اپنی ذات اپنے اختیار میں ہے، جب کہ دوسرے کی ذات اپنے اختیار میں نہیں۔

پیغمبر کی مثال

عبداللہ بن ابی کو رئیس المنافقین کہا جاتا ہے۔ اس کا انتقال مدینہ میں ۹ھ میں ہوا۔ ہجرت کے بعد یہ شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچاتا رہا اور آپ کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ یہی وہ شخص ہے جس کا ایک انتہائی اشتعال انگیز قول قرآن میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

یقولون لئن رجعنا الی المدینہ لیخرجن الاعزّ منہا الاذل (المنافقون ۸)	وہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہونچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔

عبداللہ بن ابی نے غزوۂ بنی المصطلق (۶ھ) سے واپس آتے ہوئے سفر کے دوران فتنہ انگیزی کی اور اس قسم کی اشتعال دلانے والی باتیں کیں۔ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ آپ کو عبداللہ بن ابی کی فتنہ انگیزی کی خبر ملی تو فوراً آپ نے وہاں سے روانگی کا حکم دیدیا۔ اس وقت مدینہ کے ایک سردار اُسید بن حُضیر آپ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے ایسے وقت میں سفر کا حکم دے دیا ہے جب کہ معمولاً آپ سفر نہیں کرتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ عبداللہ بن ابی نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں۔ اس کے جواب میں اُسید بن حُضیر نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اِس شخص کے ساتھ نرمی اور درگذر کا معاملہ فرمائیے۔ کیوں کہ خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہمارے پاس مدینہ لایا اور اس شخص کی قوم اس کے لیے موتی پرو رہی تھی تاکہ (اس کو اپنا بادشاہ بناکر) اس کو تاج پہنائے۔ پس وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ نے اس کا ملک اس سے چھین لیا ہے (یارسولَ اللہ اُرفق بہ فواللہ لقد جاءنا اللہ بک وانّ قومہ لینظمون لہ الخَرَزَ لیُتَوِّجُوہ فانہ لیری انک قد اِستَلَبتَہ مُلکا) چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر تک عبداللہ بن ابی کے ساتھ نرمی اور درگذر کا معاملہ فرمایا (سیرۃ ابن ہشام، ۲/۳۷-۳۳۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ سنّت بتاتی ہے کہ جو لوگ سلبِ دنیا کی نفسیات کے تحت دشمن بنیں، ان کا مقابلہ رِفق کے ذریعہ کیا جانا چاہیے نہ کہ تشدد کے ذریعہ۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ سبب پر غور کرنا چاہیے۔ اور اگر معلوم ہو کہ دشمنی کے پیچھے ذاتی نقصان کا احساس پایا جاتا ہے تو ایسے آدمی کو معذور سمجھ کر اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔

اسوۂ رسول

قدیم مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام دینا شروع کیا تو اہل مکہ کی اکثریت نے آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ وہ آپ کے خلاف طعنہ زنی کرتے، آپ کا مذاق اڑاتے اور غلط بحثیں کرتے (فجعلت قریش یهمزونه ویستهزؤن به ویخاصمونه، ۳۷۶)

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ وہ ہے جو ابولہب کی بیوی (ام جمیل) سے متعلق ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ام جمیل نے جب سورہ مَسَد کو سنا جس میں اس کا اور اس کے شوہر کا ذکر ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جب کہ آپ بیت اللہ میں تھے۔ ابوبکر صدیق بھی آپ کے پاس تھے۔ اس وقت وہ سخت غصہ میں تھی۔ اس نے کہا کہ میں شاعرہ ہوں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں یہ شعر پڑھا:

مُذَمَّماً عَصَيْنَا وَاَمْرَهُ ابَيْنَا وَدِيْنَهُ قَلَيْنَا

ایک قابل مذمت شخص کی ہم نے نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مذمّم رکھا تھا۔ اس طرح وہ آپ کے خلاف سب وشتم کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی یہ باتیں سن کر فرماتے:

الاتعجبون لما صرف اللهُ عني من اذى قُريشٍ يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّماً وَانا مُحَمَّد (سيرة ابن هشام، الجزء الاول صفحه ۳۸۹)

کیا تم کو اس پر تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی اذیت کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو برا کہتے ہیں اور مذمّم کہہ کر ہجو کرتے ہیں۔ حالاں کہ میں محمّد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قدیم اہل مکہ آپ کو مُذمّم کہتے تھے مگر آپ کی نظر آنے والے مستقبل پر تھی جب کہ آپ عالمی سطح پر محمد بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اہل مکہ کی باتوں پر غصہ نہیں ہوئے۔ جس شخص کی نظر مستقبل کے امکانات پر ہو وہ حال کی ناخوش گواریوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ جس کو خدا سے ملا ہوا ہو وہ بندوں سے چھینے جانے پر برہم نہیں ہوگا۔ جس کی صحت پر آسمان گواہی دے رہا ہو، وہ زمین والوں کی تردید پر کبھی بددل نہیں ہوگا۔

چھوڑی ہوئی سنت

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکی دور میں قریش رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن بنے ہوئے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ آپ پھر بھی ان کی نصیحت اور خیرخواہی میں لگے ہوئے تھے۔ آپ برابر ان کی ہدایت اور نجات کے لئے دعا کرتے رہتے (یبذل لھم النصیحة ویدعوھم الی النجاة مما ھم فیه)

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ آئے۔ قریش نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس طرح بدگمان کر دیا کہ وہ آپ سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے۔ تاہم ایک روز انھوں نے بیت اللہ میں آپ سے قرآن سنا اور اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد طفیل بن عمرو الدوسی اپنے وطن گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر باپ اور بیوی کے سوا کسی نے اسلام قبول نہ کیا۔ وہ دوبارہ مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ انھوں نے قبیلہ دوس کے بارے میں سخت تاثر کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں ابن اسحاق نے ان کی جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم دعوتُ دوسا الی الاسلام فأبطؤا علیّ ثم جئت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکة فقلت له یا نبیّ اللہ انه قد غلبنی علی دوس الزنا فادع اللہ علیھم فقال اللھم اھدِ دوسًا، ارجع الی قومك فادعُھم وارفق بھم

(سیرة ابن ہشام)

پھر میں نے قبیلہ دوس کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے ماننے میں دیر کی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ آیا اور آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول، قبیلہ دوس کھیل تماشے میں منہمک ہے، اس کے لئے بددعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا، اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ۔ اس کو اسلام کی دعوت دو اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔

کہنے والے نے آپ سے بددعا کی درخواست کی تھی مگر آپ اس کے جواب میں دعا کرنے لگے۔

نبیٔ رحمت کا طریقہ

فتح مکہ کے بعد مکہ کی بہت سی عورتوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اسلام قبول کیا۔ انھیں میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی۔ یہ وہی عورت ہے جس نے احد کی جنگ میں حضرت حمزہ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ وہ کئی عورتوں کے ساتھ آئی۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے محمدؐ کے سامنے کلام کیا تو وہ پہچان لیں گے، اور اگر انھوں نے پہچان لیا تو وہ مجھے قتل کردیں گے (فقالت إنّي إن اتكلم يعرفني وإن عرفني قتلني)

چنانچہ بیعت کے وقت ہند نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ مگر وہ اونچے خاندان کی عورت تھی، اس لیے وہ اپنی بڑائی کے احساس سے چپ نہ رہ سکی۔ بیعت کے الفاظ ادا کراتے ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا کہ یوں کہو کہ ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے (ولا نقتل اولادنا) تو ہند نے بے برداشت ہو کر گستاخی کے الفاظ کہے۔ اس کے الفاظ مختلف روایتوں میں اس طرح نقل کیے گیے ہیں:

قالت هند انت قتلتهم يوم بدر فانت وهم ابصر۔	ہند نے کہا کہ آپ نے ان کو بدر کے دن قتل کردیا اس لیے آپ جانیں اور وہ جانیں۔
ربيناهم صغاراً فقتلتموهم كباراً	ہم نے چھوٹے پر انھیں پالا اور بڑے پر آپ نے انھیں قتل کردیا۔
تقتل آباءهم وتوصينا باولادهم	آپ خود تو ان کے باپوں کو قتل کرتے ہیں اور ہم کو ان کی اولاد کے بارہ میں نصیحت کر رہے ہیں۔

ہند نے اس سے پہلے بھی بار بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مذکورہ واقعہ میں تو اس نے رو در رو توہین رسالت کا ارتکاب کیا، موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم رہنماؤں نے جو خود ساختہ اسلام وضع کر رکھا ہے، یہی اسلام اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ہوتا تو آپ فوراً ہند کو قتل کرادیتے۔ مگر آپ نے بیعت لے کر ہند کو اسلام میں داخل کرلیا۔

آج مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو کھوئی گئی ہے وہ نبی رحمت کا یہی طریقہ ہے۔

اخلاق رسولؐ

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایک غزوہ وہ ہے جس کو ذات الرقاع کہا جاتا ہے۔ یہ جمادی الاول ۴ھ میں پیش آیا، اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ سفر کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر آرام فرما رہے تھے۔ آپ کی تلوار درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔

اس وقت آپ تنہا تھے۔ ایک مشرک غورث بن الحارث نے آپ کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے فاتحانہ انداز میں کہا کہ کیا میں تمہارے لیے محمد کو قتل نہ کردوں (الا اقتل لکم محمداً) انھوں نے کہاں ہاں (قالوا بلی) اس کے بعد وہ خاموشی سے وہاں پہونچا جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تنہا لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے درخت سے تلوار اتاری اور ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اس نے کہا کہ اے محمدؐ، اب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے (من یمنعك مني یا محمد) آپ نے فرمایا اللہ۔ آپ کی زبان سے پر اعتماد لہجہ میں "اللہ" کا نام سن کر مشرک پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس نے تلوار رکھ دی۔ اب آپ نے وہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس سے کہا کہ بتاؤ، اب تم کو کون میرے ہاتھ سے بچائے گا۔ اس نے کہا کہ آپ بہتر صاحب تلوار بنیں (کُن خیرَ آخذ) اس کے بعد آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور کہا کہ جاؤ میں نے تم کو معاف کیا۔

اس واقعہ کے بعد وہ مشرک اپنے قبیلہ میں واپس چلا گیا۔ وہی شخص جو اپنے قبیلہ سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ میں محمدؐ کو قتل کرنے جا رہا ہوں، اب ان سے یہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آیا ہوں جو تمام انسانوں میں سب سے بہتر انسان ہے (جئتکم من عند خیر الناس) سیرۃ ابن کثیر ۳/۱۶۴

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر مذکورہ مشرک کی گستاخی اور اس کے جرم پر اس کو قتل کر دیتے تو اس کے قبیلہ میں یہ خبر پہونچتی کہ محمد نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا۔ اس خبر سے قبیلہ والوں میں انتقامی احساس جاگتا۔ مگر اب قبیلہ والوں میں یہ خبر پہونچی کہ محمدؐ بہترین اخلاق کے آدمی ہیں۔ انھوں نے مجرم پر قابو پانے کے باوجود اس کو معاف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر اخلاقی احساس جاگ اٹھا۔ پہلے مذکورہ شخص (غورث بن الحارث) نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد اس کا پورا قبیلہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ایک روش کی صورت میں وہاں انتقام کی ہوائیں چلتیں، دوسری روش کی صورت میں وہاں دین رحمت کی ہوائیں چل پڑیں۔

جاہلیت کی پکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق (۵ھ) سے واپس آرہے تھے۔ راستہ میں ایک مقام پر آپ نے پڑاؤ ڈالا۔ یہاں پر مریسیع نام کا ایک کنواں تھا۔ یہاں پانی لیتے ہوئے دو مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک مسلمان کا تعلق مہاجرین سے تھا اور دوسرے مسلمان کا تعلق انصار سے۔ جب تکرار بڑھی تو دونوں نے اپنے اپنے قبیلہ کو حمایت کے لیے پکارا۔ ایک نے کہا کہ یامعشر الانصار (اے گروہ انصار) دوسرے نے کہا کہ یامعشر المهاجرين (اے گروہ مہاجرین) اس کے بعد دونوں گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف جمع ہو گئے اور قریب تھا کہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں۔ ایک روایت کے مطابق، پکار کے الفاظ یہ تھے: یاللانصار (اے انصار دوڑو) یاللمهاجرين (اے مہاجرین دوڑو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ وہاں آئے اور پوچھا کہ یہ جاہلی پکار کیا ہے (ما بال دعوى الجاهلية) لوگوں نے قصہ بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ یہ سب گندی باتیں ہیں (دعوها فانها منتنة) حیاۃ الصحابہ ۱/ ۴۷۲-۴۷۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پکار کو جاہلیت کی پکار کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ پکار دو آدمیوں کے انفرادی مسئلہ کو پوری قوم کے لیے غیرت اور حمیت کا مسئلہ بنا رہی تھی، ہر معاشرہ میں ایسا ہوتا ہے کہ مقامی سطح پر بعض افراد کے درمیان کچھ نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی نزاع کو عمومی رنگ دینا اس کو غیر ضروری طور پر بڑھانا ہے۔ ہر وہ پکار جاہلیت کی پکار ہے جس میں کسی ذاتی یا مقامی مسئلہ کو جذباتی نعروں کے ذریعہ پوری قوم کا مسئلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔

جزئی یا مقامی مسئلہ کو جزئی یا مقامی دائرہ میں رکھ کر اسے حل کرنا چاہیے۔ اگر ایسے کسی مسئلہ کو جذباتی اشو بنا کر کہا جانے لگے کہ یہ ہمارے قومی وجود کی علامت ہے۔ یہ ملی غیرت کے لیے چیلنج ہے، یہ پوری امت کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، تو یہ سب جاہلیت کی پکار ہوگی۔ اور جاہلیت کی پکار سے بربادی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔ جزئی مسئلہ کو اگر اپنے حال پر رہنے دیا جائے تو اس کو حل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر جب اس کو بڑھا دیا جائے تو اس کو حل کرنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہوگا جتنا زیادہ اس کو بڑھایا گیا ہے۔

فطری سادگی

صحیح روایات کے مطابق نبوت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک حج ادا کیا۔ یہ وہی حج ہے جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ یہ حج آپ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے سنہ ۱۰ھ میں ادا فرمایا۔

حجۃ الوداع کے بارے میں بہت تفصیلی روایات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ طواف کے بعد آپ نے صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان سعی کی۔ اس سعی کا آغاز آپ نے صفا سے کیا۔ اس وقت آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا: ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔ ابدأ بما بدء اللہ بہ (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع فرمایا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیت میں جہاں صفا اور مروہ کا لفظ ہے وہاں جملہ میں صفا کا لفظ پہلے ہے اور مروہ کا لفظ اس کے بعد۔ اسی ترتیب کو آپ نے سعی میں بھی اختیار کیا۔ یعنی قرآن کی آیت چوں کہ صفا سے شروع ہوتی تھی اس لئے آپ نے بھی اپنی سعی صفا سے شروع فرمائی۔ صفا سے چل کر آپ مروہ کی طرف گئے۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے۔ اگر آپ مروہ سے اپنی سعی کا آغاز کرتے تو آدمی کو غیر ضروری طور پر صفا اور مروہ کے بارہ میں دو ترتیب یاد رکھنی پڑتی۔ ایک قرآن کی آیت میں ان الفاظ کی ترتیب، دوسری حج کی سعی میں ان کی ترتیب۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں جگہ ایک ہی ترتیب جاری کرکے لوگوں کو غیر ضروری تکلف سے بچالیا۔

یہ اسلام کی ایک روح ہے جس کو ہمیں ہر معاملہ میں پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اسلام ایک سادہ مذہب ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں اور غیر ضروری تکلفات سے پاک ہے۔ اسلام میں روح پر زور دیا گیا ہے اور ظواہر کو ثانوی درجہ میں رکھا گیا ہے۔ اسلام میں اساسی باتوں اور جزئی باتوں میں فرق کیا گیا ہے، اساسی باتوں کو اساسی اہمیت دی گئی ہے اور ضمنی باتوں کو ضمنی اہمیت۔ اسلام کو سادہ حقیقتوں پر قائم کیا گیا ہے نہ کہ عقلی بحثوں اور منطقی موشگافیوں پر۔ اسلام کو اختیار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ہوا اور پانی کو اختیار کرنا۔

ہدیۂ رحمت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (ہم نے تم کو عالم والوں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ سے کہا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ، مشرکین کے خلاف بد دعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمة)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کی رحمت ہوں جو ہدیہ کے طور پر بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابن عمر قال، قال رسول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم : ان الله بعثني رحمة مهداة بعثت برفع قوم وخفض آخرين (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۰۱)	عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ نے مجھ کو رحمت اور ہدیہ بنا کر بھیجا ہے۔ میں ایک قوم کی بلندی اور دوسری قوم کی پستی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے نمونہ ہیں۔ نیز ختم نبوت کے بعد آپ کی امت آپ کی نیابت کے مقام پر ہے۔ اب امت کو اقوام عالم کے لیے وہی کچھ بننا ہے جو آپ اپنی زندگی میں لوگوں کے لیے بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری اقوام کے لیے خدا کی طرف سے رحمت اور تحفہ تھے، اب آپ کی تبعیت میں آپ کی امت کو بعد کی قوموں کے لیے اسی طرح رحمت اور تحفہ بننا ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر اس امت کا امت محمدی ہونا متحقق نہ ہوگا۔

امت محمدی کو دوسروں سے مانگنا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو دینا ہے۔ انھیں لوگوں کے لیے خدا کا ہدیۂ رحمت بننا ہے۔ انھیں اس طرح رہنا ہے کہ ان سے اہل عالم کو نفع بخشی کا تجربہ ہو نہ کہ ضرر رسانی کا۔

اس مقصد کے لیے امت کو صبر کرنا ہے تاکہ وہ چھیننے کے باوجود دے۔ تاکہ وہ زیادتیوں کے باوجود لوگوں کی خیر خواہ بنے۔ تاکہ ظلم کے باوجود وہ اپنے آپ کو انتقام کے جذبہ سے پاک رکھے۔ صبر و برداشت کی صفت کے بغیر وہ امتحان کی اس دنیا میں دوسروں کے لیے ہدیۂ رحمت نہیں بن سکتی۔ اور جب تک وہ دوسروں کے لیے رحمت نہ بنے، خود اس کے اوپر بھی خدا کی رحمت کے دروازے بند رہیں گے۔

حالاتِ صحابہ

ہیروؤں کی نرسری

پروفیسر ہٹی نے عرب مسلمانوں کی غیر معمولی ترقیات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مختلف شعبوں میں جو کارنامے انجام دئے، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کی فوجی مہمیں جو عراق، ایران، شام اور مصر میں جاری ہوئیں وہ بلاشبہ تاریخ کی انتہائی کامیاب مہموں میں سے تھیں۔ ان کی ان جنگی مہموں کا مقابلہ بالکل بجا طور پر نپولین، ہنے بال اور سکندر کی جنگی مہموں سے کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح کی مثالیں بیان کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں کہ پیغمبر کی وفات کے بعد عرب کی بنجر زمین گویا جادو کے زور سے ہیروؤں کی نرسری میں تبدیل ہوگئی۔ ایسے ہیرو جن کے مثل کہیں اور پانا بے حد مشکل ہے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی اور خصوصیت کے اعتبار سے بھی:

> After the death of the Prophet sterile Arabia seems to have been converted as if by magic into a nursery of heroes the like of whom both in number and quality is hard to find anywhere.
>
> P.K. Hitti, *History of the Arabs* (1979), p. 142

یہی کسی تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ وہی تحریک عظیم تحریک ہے جس نے اپنے عمل کے دوران عظیم انسان پیدا کئے ہوں۔ کیونکہ عظیم انسان ہی دراصل کوئی عظیم واقعہ ظہور میں لاتے ہیں نہ کہ شاعری اور خطابت کے ہنگامے۔

اسلامی انقلاب ایسی تحریک کے ذریعہ وجود میں آتا ہے جو اپنے گرد جمع ہونے والے افراد میں اعلیٰ حوصلہ اور اونچا کردار پیدا کرے۔ جس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ ہیروؤں کی نرسری کی مانند بن گیا ہو۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی مثال ایسی ہو جیسے جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل، وہ زمین کو صرف فساد سے بھریں گے، ایسے لوگ کبھی اسلامی انقلاب برپا کرنے والے نہیں بن سکتے۔

صحابہ کرام تاریخ انسانی کے بہترین لوگ تھے۔ وہ اعلیٰ ترین بشری اوصاف کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔

ایمانی کردار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ کی بات ہے۔ لوگ نماز کے لیے مسجد میں اکٹھا تھے۔ جماعت کا وقت ہو گیا مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیماری کی شدت کی وجہ سے حجرہ سے باہر تشریف نہ لاسکے۔ اس وقت حضرت ابو بکر بھی مسجد میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن زمعہ اور دوسرے لوگوں نے اصرار کر کے حضرت عمر کو امامت کے لیے آگے کر دیا۔

حضرت عمرؓ نہایت بلند آواز تھے۔ جب انھوں نے " اللہ اکبر " کہہ کر نماز شروع کی تو ان کی آواز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حجرہ تک پہنچ گئی۔ آپ نے سن کر فرمایا: ابو بکر کہاں ہیں۔ اللہ اور مسلمان اس پر راضی نہیں، (این ابوبکر، یابی اللّٰہ ذالک والمسلمون) اس کے بعد آپ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابو بکر بلائے گیے، اور حضرت عمر کے بجائے انھوں نے نماز پڑھائی۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے حجرہ میں تھے۔ چونکہ اسی امامتِ نماز پر آئندہ خلافتِ حکومت کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس لیے حضرت عمر یہ سوچ سکتے تھے کہ ان کو خدانخواستہ کسی " سازش " کے تحت امامت کے مقام سے ہٹایا گیا ہے، اور اس سازش کا اصل دماغ عائشہ ہیں جو حضرت ابو بکر کی صاحبزادی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بنانے کے لیے یہ ڈرامہ کروایا ہے۔

مگر حضرت عمر کا خوفِ خدا اس میں مانع تھا کہ وہ اس قسم کی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ عمر نے ابو بکر پر کسی قسم کا الزام نہیں لگایا (کان عمر غیر مُتَّھِمٍ علی ابی بکر، سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۳۲)

کسی گروہ کو متحد رکھنے اور اس کی اجتماعی زندگی کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر ایک دوسرے کے بارہ میں حسنِ ظن پایا جاتا ہو۔ مضبوط اجتماعیت کے لیے حسن ظن اتنا ہی ضروری ہے جتنا مضبوط تعمیر کے لیے سمنٹ۔ دورِ اول کے مسلمان اپنی اسی خصوصیت کی بنیاد پر کامل اتحاد کا نمونہ تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس خصوصیت کو کھو دیا ہے، اسی لیے وہ اجتماعیت اور اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

محرومی پر راضی ہونا

نماز مسلمانوں پر اول دن سے فرض تھی۔ مگر پانچ وقت کی قید کے ساتھ نماز معراج میں فرض کی گئی۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں باقاعدہ طور پر باجماعت نماز کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ معمول تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تو لوگ اپنے آپ مسجد میں آجاتے۔ مگر جماعت کے باقاعدہ نظام کے لیے ضروری تھا کہ اس کے اعلان کا انتظام کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے، کسی نے کہا کہ اونچی جگہ پر آگ روشن کی جائے۔ اس طرح کے اور بھی بعض مشورے سامنے آئے مگر ان میں سے کسی کو آپ نے قبول نہیں فرمایا۔

اس کے بعد ایک صحابی کو اذان کے کلمات کی بشارت ہوئی۔ یہ عبد اللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبدربہ رضی تھے۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سبز پوش آدمی ہے۔ اس سے وہ اذان کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ آدمی ان کو بتاتا ہے کہ اس کی بہتر تدبیر یہ ہے کہ تم یہ الفاظ کہو۔ اس کے بعد اس آدمی نے اللہ اکبر سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ تک وہ تمام الفاظ بتائے جو اب نماز سے پہلے ہر مسجد سے بہ آواز بلند پکارے جاتے ہیں۔ مذکورہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا پورا خواب بیان کیا۔ آپ نے اس کو پسند کیا اور فرمایا کہ بے شک یہ سچا خواب ہے، (إنّها لرؤيا حقّ ان شاء الله، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹)

قدرتی طور پر عبد اللہ بن زید کی خواہش تھی کہ وہی موذن مقرر کیے جائیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بجائے حضرت بلال کو موذن مقرر فرمایا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (فانه اندى صوتاً منك) عبد اللہ بن زید یہ سوچ سکتے تھے کہ مجھے اذان کی بشارت ہوئی ہے، اس لیے میرا حق ہے کہ میں ہی اذان دینے والا بنوں۔ مگر اذان کا مقصد اعلان تھا اس لیے اونچی آواز والے شخص کو مقرر کیا گیا۔ عبد اللہ بن زید نے اس محرومی کو گوارا کر لیا۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ اس دنیا میں اسی گروہ کے لیے کامیابی کی راہیں کھلتی ہیں جس کے افراد اہل تر کے مقابلہ میں اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں۔

تاریخ کا فیصلہ

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس موقع پر عیسائیوں کی فرمائش پر خود حضرت عمر مدینہ سے فلسطین گئے تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل کریں۔ اس سلسلے میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے :

حان وقت الصّلوٰۃ وھو جالس فی صحن کنیسة القیامة۔ فالتفت الی البطریرك وقال لہ این اُصلّی۔ فقال مکانك صلّ۔ فقال ما کان لِعُمَر ان یصلّی فی الکنیسة فیاتی المسلمون من بعدی ویقولون ھُنا صلّی عمر ویبنون علیہ مسجداً۔ وابتعد عنھا رمیة حجر وفرش عباءته وصلّی۔ وجاء المسلمون من بعدہ وبنوا علیٰ مصلّاہ مسجداً وھو قائم علیٰ رمیة حجر من کنیسة القیامة الیٰ یومنا ھذا

عبد اللہ التل، خطر الیھودیة العالمیة علی الاسلام والمسیحیة، دار القلم، القاھرہ، ۱۹۶۴
صفحہ ۱۲۹

حضرت عمر یروشلم میں کنیسۂ قیامہ کے صحن میں بیٹھے تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ وہ بطریق کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ میں نماز کہاں پڑھوں بطریق نے کہا اپنی جگہ پر پڑھیے۔ حضرت عمر نے کہا کہ عمر کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ گرجا کے اندر نماز پڑھے۔ پھر مسلمان میرے بعد آئیں اور کہیں کہ یہاں عمر نے نماز پڑھی تھی اور اس پر مسجد بنائیں۔ حضرت عمر وہاں سے ایک پتھر پھینکنے کی مسافت کے بقدر دور گیے اور وہاں اپنی عبا بچھائی اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور ان کے نماز پڑھنے کی جگہ پر مسجد بنائی۔ یہ مسجد آج بھی کنیسۂ قیامہ سے ایک پتھر پھینکنے کی دوری پر موجود ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نزاع کے مقام سے ہٹ کر اپنی مسجد بناتے تھے۔ ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنھوں نے اصرار کیا کہ وہ جھگڑے کی جگہ پر نماز پڑھیں گے اور نزاع کے مقام پر اپنی مسجد بنائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے قلعہ میں ایک اینٹ کا بھی اضافہ نہ کرسکے۔ بلکہ اسلام کا جو قلعہ بن کر کھڑا ہو چکا تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی نادانی سے ڈھا دیا۔

سبق آموز

حضرت امیر معاویہؓ نے ایک بار دمشق میں کچھ چادریں تقسیم کیں۔ ان میں سے ایک چادر دمشق کے ایک بوڑھے آدمی کو پہونچی جو انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چادر انصاری بزرگ کو پسند نہیں آئی۔ انھوں نے غصہ میں آکر کہا کہ خدا کی قسم، میں اس چادر کو معاویہ کے سر پر ماروں گا۔ (وَاللّٰہ لاضربنّ بہا رأس معاویۃ)

حضرت امیر معاویہ اس وقت عظیم اسلامی سلطنت کے خلیفہ تھے۔ انھیں یہ بات پہونچی تو وہ اس کو سن کر غصہ نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ واقعہ بیان کرنے والے کے الفاظ میں یہ تھا :

فاستدعاہ الخلیفۃ وکشف لہ عن رأسہ وقال اوف بیمینک ولیرأف الشیخ بالشیخ	حضرت امیر معاویہ نے اس انصاری بزرگ کو اپنے یہاں بلایا اور ان کے سامنے اپنا سر کھول دیا اور کہا کہ اپنی قسم پوری کرو۔ البتہ ایک بوڑھے کو چاہیے کہ وہ دوسرے بوڑھے پر نرمی کرے۔
(الدعوۃ ۱۲ جمادی الاول ۱۴۰۷)	

انصاری نے شرمندہ ہو کر معافی مانگی اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گیے۔

حضرت امیر معاویہ اگر اس کے جواب میں خود بھی غصہ ہو جاتے اور مذکورہ شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے تو مسئلہ اور بڑھتا۔ دونوں طرف سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا۔ پورے سماج میں منفی رجحانات جنم پاتے۔ مگر انھوں نے اس سے کوئی منفی اثر نہیں لیا اور غصہ کا جواب ٹھنڈک سے دیا تو فریق ثانی خود جھک گیا۔ مزید یہ کہ پورا سماج منفی رجحانات کی پرورش سے بچ گیا۔

حضرت امیر معاویہ سوچ سکتے تھے کہ اگر میں مذکورہ رویہ اختیار کروں تو رعایا کے اوپر خلیفہ کا دبدبہ ختم ہو جائے گا اور حکومت کا نظم قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر یہ نہایت سطحی سوچ ہے ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس عام مفروضہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس دنیا میں اس سے زیادہ طاقتور کوئی شخص نہیں جو سختی کا جواب نرمی سے دے۔ جو سرکشی کے جواب میں فریق ثانی کو نرمی اور محبت کا تحفہ پیش کرے۔

اختلاف رائے

حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ دو سردار خلیفہ اول کے پاس آئے۔ ان کا نام عُیَیْنَہ بن حصن اور اقرع بن حابس تھا۔ ان دونوں کو فتح ہوازن کے بعد سو سو اونٹ دیئے گئے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے ایک زمین طلب کی۔ آپ نے تالیف قلب کے لیے انھیں یہ زمین دیدی اور ان کے لیے باقاعدہ ایک تحریر لکھ دی۔ عیینہ اور اقرع نے چاہا کہ دوسرے بڑے صحابہ کی تصدیق بھی اس عطیہ کے حق میں حاصل کرلیں۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عمر فاروق کے پاس گیے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے فرمان کو لے کر پھاڑ دیا :

جاء عيينة والاقرع يطلبان ارضًا الى ابی بکر فکتب له الخط فمزّقه عمر وقال هذا شیٔ کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یعطیکموه لیتألفکم علی الاسلام والآن فقد اعزّ الله الاسلام واغنیٰ عنکم۔ فرجعوا الی ابی بکر فقالوا الخلیفة انت ام عمر فقال هو ان شاء ووافقه

(التفسیر المظهری، جلد ۴، صفحه ۲۳۶)

عیینہ اور اقرع حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک زمین طلب کیا۔ آپ نے ان کے حق میں ایک تحریر لکھ دی۔ پھر حضرت عمر نے اس تحریر کو پھاڑ دیا۔ اور کہا کہ یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر دیتے تھے۔ مگر اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا، وہی ہیں اگر وہ چاہیں اور انھوں نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔

یہ واقعہ تنقید کی ایک نہایت شدید مثال ہے۔ مگر اس شدید تنقید کو نہ تو حضرت ابوبکر نے برا مانا اور نہ صحابہ نے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تنقید اور اختلاف رائے کی کتنی زیادہ آزادی دی گئی ہے۔

مقام عبدیت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ خلافت کے زمانہ میں ایک روز وہ اپنے گھر پر تھے اور معمولی گھریلو کام کر رہے تھے جو عام طور پر خادموں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ عین اس وقت عرب کے کچھ بڑے لوگ آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ خلیفۂ وقت کو ایک معمولی کام میں مشغول دیکھ کر انھوں نے کہا: آپ نے کسی عبد (غلام) سے یہ کام لے لیا ہوتا۔ حضرت عمر نے یہ سن کر فرمایا: اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ (مجھ سے زیادہ غلام اور کون ہو سکتا ہے)

حضرت عمر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ جو کام وہ کر رہے تھے وہ ان کے لئے محض ایک خشک کام نہ تھا بلکہ ان کی روح اس میں لذت پا رہی تھی۔ انکساری اگر نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو تو وہ آدمی کے لئے لذیذ ترین چیز ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی اصلی حیثیت کا اعتراف ہوتی ہے۔ بندہ جب تواضع اور انکساری کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ترین ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے دربار میں کسی بندہ کے لئے جو سب سے قریبی نشست ہے وہ تواضع ہی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہوتا ہے (اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد، رواہ مسلم)

شعوری سجدہ پستی اور بے نفسی کی آخری حالت ہے۔ بندہ جب حقیقی سجدہ میں ہو تو وہ اس قریب ترین مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی انسان خدا کی بارگاہ میں پہنچ سکتا ہے۔

لوگوں کو عبدیت کے مقام کی خبر نہیں، یہی وجہ ہے کہ عبدیت ان کے لئے لذیذ چیز نہیں بنتی۔ لوگ امتیاز میں جیتے ہیں پھر مساوات کی لذت کو وہ کس طرح پائیں۔ لوگ اپنی انا میں جیتے ہیں پھر خدا کی کبریائی کے اعتراف کی لذت انھیں کیسے ملے۔ لوگ دوسروں کو غلط ثابت کر کے خوش ہونا چاہتے ہیں پھر انھیں اپنی غلطی کو جاننے اور ماننے کی خوشی کیسے حاصل ہو۔ لوگ اپنے کو ایک پیمانہ سے ناپتے ہیں اور دوسروں کو دوسرے پیمانہ سے پھر وہ کیسے جانیں کہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک پیمانہ رکھنا اتنی بڑی دولت ہے کہ دنیا کی تمام دولتیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

مومن وہ ہے جس کے لئے دینی عمل ہی سب سے بڑی لذت بن جائے۔ صرف ذکر اور عبادت کے معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں۔ حسد کے جذبات کو کچلنا، انتقام کی آگ کو بجھانا، گروہی عصبیت سے اپنے کو اوپر اٹھانا، اختلاف کے باوجود انصاف کرنا، خوشامد کے بجائے حق کی بنیاد پر انسان کی قدر کرنا، یہ سب چیزیں اس کے لئے اس طرح لذیذ بن جائیں کہ ان کو چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔

تحقیق ضروری ہے

عن عَمرة بنت عبد الرحمٰن انّها قالتْ سمعتُ عائشةَ وذُكِرَ لها ان عبد الله بن عُمر يقولُ انّ الميّتَ ليُعذَّبُ ببُكاء الحيّ عليه تقول : يغفرُ اللهُ لابي عبد الرحمٰن امّا انّه لم يكذبْ ولكنّه نسيَ او اخطأ انّما مرّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم على يهوديّةٍ يُبكى عليها فقال : انّهم ليبكون عليها وانّها لتعذَّبُ فى قبرها۔

(متفق علیہ)

عمرہ بنت عبدالرحمٰن بتاتی ہیں کہ عائشہؓ کے سامنے ذکر کیا گیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ مُردہ کو زندہ کے رونے پر عذاب دیا جاتا ہے، اس کے بعد میں نے حضرت عائشہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ ابوعبدالرحمٰن کو معاف کرے، وہ جھوٹ نہیں بولے۔ مگر وہ بھول گیے یا ان سے غلطی ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت پر گزرے جس کے مرنے پر لوگ رو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں، حالاں کہ اس کی قبر میں اس کو عذاب دیا جارہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کے تقوی اور اخلاص اور حُسنِ نیّت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو اصل واقعہ کے مطابق نہ تھی۔ پھر جب ایک ایسا شخص کسی معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھنے میں غلطی کرسکتا ہے جو مسلّمہ طور پر مخلص اور متقی ہو تو عام انسانوں کا کیا شمار۔

اس طرح کی مثالیں بتاتی ہیں کہ کسی معاملہ میں رائے دینے کے لیے آدمی کو انتہائی حد تک محتاط ہونا چاہیے۔ اگر وہ رائے دینا ضروری سمجھتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھ کر ہر پہلو سے اس کی پوری تحقیق کرے۔ اور اگر معاملہ نازک ہو تو اس کے بارہ میں دعا اور استخارہ بھی کرے۔ ان ضروری مرحلوں سے گزرے بغیر جو شخص معاملات میں رائے زنی کرے، اس کے متعلق شدید اندیشہ ہے کہ وہ غلطی کر جائے۔ اس کا مخلص اور متقی ہونا غلطی نہ کرنے کی کوئی یقینی ضمانت نہیں۔

کب بولیں

حضرت ابوموسیٰ الاشعری ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو عدن کا والی مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو بصرہ کا والی مقرر کیا۔

حضرت ابوموسیٰ کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ قاضی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرے یہاں تک کہ حق اس پر اس طرح واضح ہو جائے جس طرح اس پر رات کے مقابلہ میں دن واضح ہوتا ہے (لاینبغی للقاضی ان یقضی حتی یتبین له الحق کما یتبین له اللیل من النهار) حضرت عمر فاروق نے یہ قول سنا تو کہا کہ ابوموسیٰ الاشعری نے سچ کہا، قاضی کا طریقہ یہی ہونا چاہئے (صدق ابوموسیٰ الاشعری)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے اس قول کا تعلق صرف قاضی یا حاکم سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق ہر انسان سے ہے۔ جس طرح قاضی کے سامنے دوسروں کے معاملات آتے ہیں اور وہ ان کو سن کر ان کے بارہ میں کوئی ایک رائے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کے سامنے دوسروں کے معاملات آتے ہیں اور وہ ان کے بارہ میں اپنی کوئی رائے ظاہر کرتا ہے۔ اس اظہار رائے کی حیثیت انفرادی سطح پر وہی ہے جو عدالتی سطح پر قاضی کے فیصلے کی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قاضی کا فیصلہ قانونی طور پر نافذ ہوتا ہے اور عام انسان کا قول دوسروں کے اوپر عملاً نافذ نہیں ہوتا۔

تاہم ہر آدمی کو اپنے قول کی جوابدہی آخر کار خدا کے سامنے کرنی ہے۔ اور اس اعتبار سے دونوں کی حیثیت بالکل ایک ہے۔ دونوں کی یکساں پکڑ ہونے والی ہے۔ ہر آدمی جو خدا کے سامنے حاضری کا عقیدہ رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ کسی معاملہ میں صرف اس وقت بولے جب کہ اس پر اس معاملہ کی حقیقت اس طرح کھل جائے جس طرح رات کے بعد دن اس کے اوپر واضح ہو جاتا ہے۔ جس معاملہ کی حقیقت اس طرح نمایاں طور پر واضح نہ ہو اس معاملہ میں اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ یہ کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

خدا سے ڈرنے والا آدمی صرف واضح معاملہ میں بولتا ہے۔ اور جو معاملہ واضح نہ ہو اس کو وہ اپنے خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔

جوہر شناسی

علامہ ابن قیم (۶۹۱ - ۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب طریق الہجرتین میں ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

روی عن عبد العزیز بن ابی حازم عن ابیہ عن سہل بن سعد قال: تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قولہ عزّ وجل: (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا) وغلام جالس عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: بلی واللہ یا رسول اللہ۔ ان علیہا لاقفالہا۔ ولا یفتحہا الا الذی اقفلہا۔ فلما ولی عمر بن الخطاب طلبہ لیستعملہ وقال: لم یقل ذلک الا من عقل (صفحہ ۶۶)

حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ محمد کی یہ آیت تلاوت فرمائی: کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت ایک لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آیت سن کر کہا: ہاں، خدا کی قسم اے اللہ کے رسول، بیشک دل پر اس کے تالے ہوتے ہیں۔ اور ان کو کوئی نہیں کھول سکتا سوا اس کے جس نے اس کو لگایا ہے۔ پھر جب حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس لڑکے کو بلایا تاکہ اس کو عامل بنائیں۔ اور انھوں نے کہا: لڑکے نے یہ جو بات کہی وہ عقل سے کہی۔

جو لوگ اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں ان کے لیے افراد کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ کسی ادارہ یا کسی اجتماعی عمل کی حسن کارکردگی کے ضامن ہمیشہ اس کے افراد ہوتے ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ معاشرہ میں موجود رہتے ہیں مگر جن ذمہ داروں کے ہاتھ میں افراد کے انتخاب کی ذمہ داری ہو ان کے اندر ایک صفت لازمی طور پر پائی جانی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ وہ آدمی کے جوہر ذاتی کی بنیاد پر اس کا انتخاب کریں نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

ادارہ کے ذمہ دار میں اگر خویش پروری کا جذبہ ہو۔ اگر وہ خوشامدی انسانوں کو پسند کرتا ہو۔ اگر وہ یہ چاہتا ہو کہ اس کے گرد و پیش تمام لوگ اس سے کمتر صلاحیت کے ہوں تاکہ اس کی ذاتی بڑائی قائم رہے، ذمہ دار کے اندر اگر اس قسم کا مزاج ہو تو وہ ادارہ کو بے کار انسانوں کا کباڑخانہ بنادیگا اس کے برعکس اگر اس کے اندر وہ مزاج ہو جس کا ایک نمونہ اوپر کے واقعہ میں نظر آتا ہے تو اس کا ادارہ ایک ایسا باغ ہوگا جس میں ہر قسم کے بہترین درخت لگے ہوئے ہوں، اور ہمیشہ وہ اپنا پھل دیتا رہے۔

صحیح ردعمل

ابن خلدون نے اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

یُحکیٰ فی کتب السیر والتاریخ ان اباموسیٰ الاشعری عاقب جندیا فی جیش العراق۔ فحلق شعر راسہ۔ فجمع الجندی الشعر وسافر بہ من العراق الی المدینۃ بالحجاز۔ ودخل علیٰ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقذف بالشعر امامہ وقال فی غضب۔ ھکذا یعامدنا رجالک۔ فتھلل وجہ عمر وقال لان یکون الناس کلھم فی مثل شجاعۃ ھذا احب الی من کل ما فتحنا من بلاد

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے عراقی لشکر کے ایک سپاہی کو سزا دی۔ انھوں نے اس کے سر کے بال منڈوا دئے اس کے بعد سپاہی نے بالوں کو جمع کیا اور اس کو لے کر عراق سے مدینہ آیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق سے ملا۔ اس نے کٹے ہوئے بال حضرت عمر کے آگے ڈال دئے اور غصہ میں کہا۔ تمہارے آدمی اس طرح ہمارے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر کا چہرہ چمک اٹھا۔ انھوں نے کہا۔ اگر تمام لوگ اس آدمی کی طرح بہادر ہو جائیں تو وہ مجھ کو تمام ملکوں کی فتوحات سے زیادہ محبوب ہیں۔

حضرت عمر فاروق کے لئے واقعہ کو دیکھنے کے دو رخ تھے۔ ایک یہ کہ سپاہی نے اپنے افسر کی اور خود خلیفہ وقت کی گستاخی کی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک بہادر انسان ہے۔ اور وقت کے حکمراں کے سامنے کھڑے ہو کر بھی بے باکانہ اظہار خیال سے نہیں ڈرتا۔

حضرت عمر اگر واقعہ کو پہلے رخ سے دیکھتے تو وہ سپاہی کے اوپر بگڑ جاتے۔ وہ اس کو سزا دیتے یا اپنی مجلس سے نکلوا دیتے۔ مگر انھوں نے گستاخی کے پہلو کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ سپاہی نے میرے سامنے جس جرأت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا ہے، یہ کسی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اور یہی کسی آدمی سے بڑے بڑے کام کرواتا ہے۔

اسی طرح ہر واقعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ منفی پہلو آدمی کے اندر صرف تخریبی نفسیات کو جگاتا ہے۔ اور مثبت پہلو اس کے اندر تعمیری نفسیات کو جگا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے لئے بھی کارآمد بن سکے اور دوسروں کے لئے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بڑا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو واقعات کے مثبت پہلو کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اسلامی زندگی

ایمان والے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لئے جب مکہ کے حالات سخت ہو گئے تو آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ چلے گئے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ مکہ سے جو لوگ آئے تھے وہ مدینہ میں بالکل اجنبی تھے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ مکہ کے مسلمانوں (مہاجرین) اور مدینہ کے مسلمانوں (انصار) کے درمیان مواخاۃ قائم کی گئی۔ یعنی مکہ سے آنے والے ہر شخص کو مدینہ میں رہنے والے کسی شخص کا بھائی بنا دیا گیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک مہاجر تھے۔ ان کی مواخاۃ حضرت سعد بن ربیع انصاری سے ہوئی۔ سعد بن ربیع مدینہ میں اس وقت کے لحاظ سے ایک مالدار شخص تھے۔ انھوں نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے مہاجر دینی بھائی کو واقعی بھائی کی طرح قبول کر لیا۔

حضرت سعد بن ربیع انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میرے پاس جو مال ہے وہ سب میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ میں اس کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اور میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ دونوں میں سے جو حصہ تم کو زیادہ اچھا معلوم ہو اس کو تم لے لو (و استحلفك ان تاخذ خير الحصتين)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے انصاری بھائی کی زبان سے یہ سنا تو انھوں نے ان کو دعا دی اور اس کے بعد کہا کہ تمہارا جذبہ بہت مبارک ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی جزائے خیر دے۔ مگر میں ایک ایسا شخص ہوں جس کو تجارت کرنا آتا ہے۔ اس لئے تم میرے لئے صرف یہ کرو کہ مجھ کو بازار کا راستہ بتا دو (انی رجل له حظ فی التجارة فدلنی الی السوق)

حضرت سعد بن ربیع انصاری کے لئے موقع تھا کہ وہ اپنے مال کا زیادہ حصہ کسی نہ کسی تدبیر سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے اور کچھ حصہ اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتے۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایسا کر سکتے تھے کہ ان کے انصاری بھائی نے جب اپنا نصف مال انھیں پیش کر دیا تو وہ فوراً اس کو لے لیتے۔ مگر دونوں نے وہ کیا جو ان کا ایمان اور تعلق باللہ ان سے تقاضا کر رہا تھا۔

انصاری مسلمان نے اپنے مال کا نصف حصہ مہاجر مسلمان کو پیش کر دیا۔ دوسری طرف مہاجر مسلمان نے اپنے انصاری بھائی کو دعا دیتے ہوئے اپنی محنت پر بھروسہ کیا۔ ایک کا جذبۂ ایمان ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا اور دوسرے کا خود اعتمادی کی صورت میں۔

تصدیق، اعتراف

مطلوب انسانی شخصیت کے دو درجے ہیں۔ ایک تصدیق کا درجہ، اور دوسرا اعتراف کا درجہ۔ ان دونوں قسم کی شخصیتوں کے دو معیاری نمونے (Models) اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں قائم کر دیے ہیں۔ ایک، ابوبکر بن ابی قحافہ کا نمونہ، اور دوسرا، عمر بن الخطاب کا نمونہ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی طرف بلایا، اس کے لیے اس میں کچھ نہ کچھ تاخیر اور سوچ اور تردد ہوا، سوا ابوبکر بن ابی قحافہ کے۔ جب میں نے ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کو قبول کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہ کیا (ما دعوت احدا الی الاسلام الا کانت فیہ عندہ کبوۃ ونظر وتردد الا ما کان من ابی بکر بن ابی قحافۃ ما عکم عنہ حین ذکرتہ لہ وما تردد فیہ، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۶۸)

عمر بن الخطاب کے اسلام کا معاملہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ ان کے قبول اسلام کا قصہ تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اپنے گھر سے اسلام کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے اور جب اسلام (قرآن) کو سنا تو خود قتل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کو اس لیے مارا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب بہن کے جسم سے خون بہنے لگا تو اس کو دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے قرآن دکھاؤ۔ اس کے بعد انھوں نے سورہ طٰہٰ پڑھی۔ اس کو پڑھتے ہی ان کے اندر اعتراف کی نفسیات جاگ اٹھی۔ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھذا الکلام واکرمہ (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۶۷)

ایک انسان وہ ہے جو پوری طرح فطرت خداوندی پر قائم ہے۔ اس کے سامنے سچائی آتی ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ عین اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کی فطرت پر ماحول کے اثر سے کچھ پردے پڑ گئے۔ تاہم اس کا انسانی جوہر بدستور پوری طرح زندہ ہے۔ وہ ابتداءً شبہ اور تردد کا شکار ہوتا ہے۔ مگر جب دلائل سے بات واضح ہو جاتی ہے تو اس کے بعد وہ حق کے آگے ڈھ پڑتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو دل و جان سے قبول کر لیتا ہے۔ پہلے کردار کا مثالی نمونہ ابوبکر صدیق ہیں اور دوسرے کردار کا مثالی نمونہ عمر فاروق۔

دو انسان

غزوۂ احد (۳ ھ) میں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگیے۔ مسلمانوں میں بہت سے لوگ زخمی یا شہید ہوگیے۔ جنگ کے خاتمہ پر مشرکین کا سردار ایک ٹیلہ پر کھڑا ہوا اور فاتحانہ جذبہ کے تحت بلند آواز سے پکار کر کہا: لنا عُزّیٰ ولا عُزّیٰ لکم (ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر مسلمانوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم (اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں)

ان دونوں فقروں کی نفسیات پر غور کیجئے۔ مشرکین کا فقرہ فخر کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کے برعکس اہلِ ایمان کا فقرہ عبدیت کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ۔ مشرک اپنے اکابر کو بُت بنا کر انھیں پوجتے ہیں۔ وہ فخر کی نفسیات میں جینے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مومن اللہ رب العالمین کو اپنا معبود بناتا ہے، وہ اس کے آگے جھک کر اس کے بڑے ہونے کا اور اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ یہ چیز مومن کو تواضع کی نفسیات میں جینے والا انسان بنا دیتی ہے۔

یہی نفسیاتی فرق وہ سب سے بڑی پہچان ہے جو اہل حق اور اہل باطل کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اہل حق عین اپنے مزاج کے تحت فخر اور ناز کے جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ انھیں تواضع میں لذت ملتی ہے۔ اپنے کو غیر نمایاں کرنا ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ ان کا بولنا آہستگی کا بولنا ہوتا ہے۔ ان کی ہر روش میں نرمی اور اعتدال کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اللہ کو سمجھتے ہیں، اور اپنے آپ کو بے کچھ کے مقام پر بٹھا کر راضی ہوجاتے ہیں۔

اہل باطل کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فخر اور گھمنڈ کے جذبات میں جیتے ہیں۔ وہ شہرت اور سرداری کے مقام پر بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو ان کا ہر بول انانیت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ چلتے ہیں تو ان کا چلنا ناز کا چلنا ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت مطمئن ہوتے ہیں جب کہ اپنے آپ کو سب سے اونچی کرسی پر بٹھانے میں کامیاب ہوجائیں۔

شرک کی نفسیات سے فخر پیدا ہوتا ہے اور توحید کی نفسیات سے تواضع اور عبدیت۔

آدمی کی پہچان

تقدم رجل لاداء الشهادة عند عمر رضی اللہ عنہ فقال له ائتنی بمن یعرفك۔ فاتاہ برجل فقال له امیر المومنین، هل انت جارہ الادنی الذی یعرف مدخله ومخرجه؟ فقال: لا، قال هل کنت رفیقه فی السفر الذی یستدل به علی مکارم الاخلاق؟ قال: لا، قال: هل عاملته بالدینار والدرهم الذی یستبین منه ورع الرجل قال: لا، قال: اظنك رایته قائماً فی المسجد یتلو القرآن، یخفض راسه تارۃ ویرفعه اخری قال: نعم، فقال امیر المومنین: اذهب فلست تعرفه۔

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص گواہی دینے کے لیے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی ایسا آدمی لے آؤ جو تم کو جانتا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک آدمی کو لے آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا۔ کیا تم اس شخص کے قریبی پڑوسی ہو جو اس کے آنے کو اور جانے کو دیکھتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے پوچھا۔ کیا تم اس کے ساتھ سفر میں رہے ہو جس میں آدمی کا اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے پوچھا۔ کیا تم نے اس کے ساتھ دینار اور درہم کا معاملہ کیا ہے جس کے ذریعہ آدمی کا تقویٰ ظاہر ہوتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم نے اس کو مسجد میں دیکھا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اور قرآن پڑھ رہا ہے، کبھی وہ اپنا سر نیچے لے جاتا ہے اور کبھی اپنا سر اوپر اٹھاتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم واپس جاؤ، کیوں کہ تم اس کو نہیں جانتے۔

مذکورہ آدمی جس شخص کی نیکی کی گواہی دینے آیا تھا، اس کو اس نے "خدا" کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس نے اس کو "انسان" کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے اس آدمی کی رائے کو نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانی معاملات میں کوئی شخص نیک ثابت نہ ہو اس وقت تک اس کی نیکی کا کوئی اعتبار نہیں۔

کتنا فرق

خنسار (تماضر بنت عمرو بن الحارث) عرب کی مشہور شاعرہ تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ اس کے لئے اتنا سخت ثابت ہوا کہ وہ اس کے اوپر چھا گیا۔ وہ ہر وقت غم میں ڈوبی رہتی اور دردناک اشعار پڑھ پڑھ کر روتی رہتی۔

خنسار نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں قادسیہ کی جنگ چھڑی تو اس نے اپنے چار لڑکوں کو جہاد کے لئے روانہ کیا۔ یہ چاروں لڑکے جنگ قادسیہ میں شہید ہوگئے۔ جب اس نے اس حادثہ کی خبر سنی تو اس کی زبان سے نکلا:

الحمد للہ الذی شرفنی بقتلھم فی سبیل نصرۃ الدین، واعلاء کلمۃ الاسلام۔ وارجو ان یلحقنی بھم فی مستقر رحمتہ

اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے یہ عزت دی کہ میرے لڑکے نصرت دین اور اعلاء کلمۃ الاسلام کی راہ میں مارے گئے۔ اور میں امید کرتی ہوں کہ خدا مجھے اپنی رحمت کے مقام پر ان سے ملائے گا۔

ایک عورت جو اسلام سے پہلے اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کرسکی تھی وہی عورت اسلام کے بعد اپنے چار بیٹوں کے قتل کی خبر کو اتنے اطمینان کے ساتھ سنتی ہے کہ اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکل جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ اسلام اور جاہلیت کا فرق ہے۔ جاہلیت زدہ انسان دنیا میں جیتا ہے۔ دنیا کا فائدہ دیکھ کر اس کا دل بڑھتا ہے۔ اور دنیا کا نقصان ہو تو اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام آدمی کی نظر میں آخرت کو اہم بنا دیتا ہے۔ وہ انھیں چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو آخرت کے لحاظ سے اہم ہوں اور جن چیزوں کی اخروی اہمیت نہ ہو وہ اس کی نظر میں اتنی غیر اہم بن جاتی ہیں گویا ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

اسلام آدمی کے اندر ہمت پیدا کرتا ہے، وہ خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے آدمی کو بے خوف کر دیتا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر محدود دیت نگاہ کو ختم کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک امکان کے خاتمہ کے بعد دوسرے امکان کو دیکھنے لگتا ہے، وہ ایک محرومی میں مبتلا ہو کر دوسری کامیابی کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پاتا ہے۔ اسلام آدمی کے ذہن کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ وہاں بھی دیکھ لے جہاں لوگوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ وہاں سے بھی اپنے لئے کام کی بات پالے جہاں لوگوں کو کوئی کام کی بات نظر نہیں آتی۔ اسلام اور غیر اسلام میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اُجالے اور اندھیرے میں۔

جگانے کے لیے

سلطان عبدالرحمن الناصر اسپین کا ایک مسلم حکمراں تھا۔ اس نے ۲۵ سال کی محنت سے قرطبہ کے پاس ایک شان دار محل بنایا۔ یہ محل چار میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین پر واقع تھا، سیکڑوں تاج محل اکٹھا کئے جائیں تب اس کا محل تیار ہوگا۔ اس محل کا نام اس نے الزہرار رکھا۔ مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو قصر الزہرار کے بجائے مدینۃ الزہرار کہنے لگے۔

سلطان عبدالرحمن الناصر کے زمانہ میں ایک بار اسپین میں قحط پڑا۔ بارش رک جانے کی وجہ سے لوگ بے حد پریشان ہو گئے۔ جب حالات بہت سخت ہوئے تو سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا جو قرطبہ کی جامع مسجد کے امام اور قاضی تھے۔ قاصد نے قاضی منذر سے کہا کہ سلطان نے مجھ کو یہ پیغام لے کر بھیجا ہے کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں۔ قاضی منذر نے پوچھا کہ سلطان خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ آج سے زیادہ ہم نے کبھی سلطان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ زمین پر سجدہ میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو میری وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا، حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھذہ ناصیتی بیدک اتراک تعذب بی الرعیۃ و انت ارحم الراحمین)

قاضی منذر نے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ کیونکہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ قاصد واپس ہو کر سلطان کے پاس پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

زمین پر خشک سالی اس لئے آتی ہے تاکہ آنکھوں کی خشک سالی ختم ہو۔ آسمان پر بادل اس لئے گرجتے ہیں تاکہ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے دہلیں۔ گرمی کی شدت اس لئے ہوتی ہے کہ لوگ جہنم کی آگ کو یاد کرکے تڑپ اٹھیں۔ صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ تیز آندھی آتی تو وہ مسجد کی طرف بھاگتے کہ کہیں قیامت نہ آگئی ہو۔ مگر جب بے حسی پیدا ہو جائے تو کوئی بھی واقعہ لوگوں کے دلوں کو نہیں پگھلاتا۔ خدا کی نشانیاں ان کے پاس گرجتی ہیں مگر ان کے کان ان کو نہیں سنتے۔ خدا روشن سورج بن کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے محروم رہتی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ خدا سے دور وہ ہیں جس کا دل بے حس ہو گیا ہو (ان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی)

اتحاد کب قائم ہوتا ہے

سر ایچ۔ اے۔ آر گب (۱۹۷۱ — ۱۸۹۵) مشہور مستشرق ہیں۔ وہ انگریزی کے علاوہ عبرانی، عربی آرامی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ کو پڑھنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ پختہ عیسائی ہونے کے باوجود انھیں سلطان صلاح الدین ایوبی سے خاص دل چسپی تھی۔ انھوں نے سلطان کے پانچ معاصر مصنفین کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا ——— ابن ابی طے، ابن الاثیر، قاضی بہاء الدین ابن شداد، عماد الدین، القاضی الفاضل۔

پروفیسر گب نے سلطان صلاح الدین ایوبی سے متعلق مراجع کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ منظر دکھائی دیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک جنگ کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ رہ کر ایک مستعد دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ سلطان صلاح الدین اگرچہ کوئی بہت بڑے جنگی ماہر یا کوئی خاص تجربہ کار حکمراں نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی یہ صلاحیت تھی کہ وہ صلیبی حملہ آوروں کے خلاف اپنی قوم کے مختلف عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو ایک محاذ پر یکجا اور متحد کر سکتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی بے غرضی، ان کی فیاضی، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کی ایمانداری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ موافق اور مخالف دونوں ہی ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ان کی یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں کی مختلف قوتوں کو ساتھ لے کر دشمن کا متحدہ مقابلہ کریں اور کامیاب ہوں (خلاصہ)

Studies on the Civilization of Islam

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور اتحاد کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قوم کے ذمہ داروں کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ دوسروں کا اعتراف کرتے ہوں۔ ان کے سینہ میں اتنی کشادگی ہو کہ وہ دوسروں کو ان کا واقعی مقام دے سکیں۔ وہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے سے زیادہ اجتماعی مقاصد کو نمایاں کرنے میں دل چسپی رکھتے ہوں۔

اپنے آپ کو دوسروں کے قریب لے جانے کا نام اتحاد ہے۔ مگر اکثر لوگ دوسروں کو اپنے قریب لانے کا نام اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔

تاریخی واقعات

دعوتی ذہن

خلیفہ عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۶۲ ھ) کی سلطنت کے حدود سندھ اور بخارا سے لے کر مراکش اور اندلس تک بلکہ فرانس تک پہنچے ہوئے تھے۔ مگر آپ کے اندر ذرا بھی عیش اور گھمنڈ نہ تھا۔ آپ نے خلافت کا کام اتنے عادلانہ انداز سے چلایا کہ مفتوحہ ممالک میں بے شمار لوگ مسلمان ہو گئے۔

آپ کے زمانہ میں جراح بن عبد اللہ خراسان کا گورنر تھا۔ اس کے متعلق آپ کو خبر پہنچی کہ ذمیوں میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں ان سے بھی وہ جزیہ وصول کرتا ہے۔ آپ نے یہ شکایت سن کر جراح بن عبد اللہ کے پاس حکم بھیجا کہ "جو شخص نماز پڑھتا ہو اس سے جزیہ نہ لو"

لوگوں کو جب اس کی خبر معلوم ہوئی تو لوگ تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔ جراح بن عبد اللہ کو خیال ہوا کہ یہ لوگ دل سے اسلام قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام کا کلمہ پڑھ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ختنہ کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لینا شروع کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ جس شخص نے ختنہ کرایا ہو صرف وہی مسلمان سمجھا جائے گا۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے مذکورہ گورنر کو دوبارہ لکھا :

اللہ نے اپنے پیغمبر کو داعی بنا کر بھیجا ہے، خاتن بنا کر نہیں بھیجا۔

اسی طرح ایک گورنر نے آپ سے یہ شکایت کی کہ مفتوحہ ممالک میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ چونکہ اسلام کے بعد جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کے کثرت اسلام سے مملکت کا مالیہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہی حالت رہی تو خزانہ خالی ہو جائے گا۔ آپ نے گورنر کو لکھا کہ تمہاری خرابی ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے، وہ ٹیکس وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ (ویحك ان محمداً صلى الله عليه وسلم بُعث هاديا ولم يُبعث جابيا)

آدمی کا رویہ ہمیشہ اس لحاظ سے بنتا ہے کہ اس کے سامنے جو مقصد ہے وہ کیا ہے۔ ایک مسلم حکمراں کا مقصد اگر طاقت اور دولت ہو تو وہ اسلامی دعوت کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ ہر چیز کو اس لحاظ سے دیکھے گا کہ اس سے طاقت اور قوت بڑھانے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔

اس کے برعکس حکمراں اگر دعوتی ذہن رکھتا ہو تو وہ دوسرے مفادات کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ ہر دوسرے نقصان کو گوارا کر لے گا مگر دعوت میں کسی بھی قسم کے نقصان کو گوارا نہیں کرے گا۔

جواہر بھوک نہ مٹا سکے

مستعصم باللہ عباسی دور کا آخری خلیفہ تھا جس نے بغداد میں حکومت کی۔ تاتاریوں کے سردار ہلاکو خاں کے ہاتھوں وہ ۶۵۶ھ میں ذلیل طریقہ سے مارا گیا۔ یہی وہ خلیفہ ہے جس کے زمانہ میں تاتاریوں نے مسلم سلطنت کو برباد کیا۔ انھوں نے اتنے مسلمان قتل کئے کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان شاہی کتب خانہ کی کتابیں جمع کیں اور دجلہ میں ڈال دیں تو کہا جاتا ہے کہ دجلہ کا پانی ان کتابوں کی سیاہی سے کالا ہوگیا اور عرصہ تک کالا رہا۔

مستعصم باللہ کے پاس زر و جواہر کا زبردست خزانہ تھا مگر اس کو اس نے تہ خانوں میں بند کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے شیعہ وزیر علقمی کے مشورہ پر اپنے فوجیوں کی تنخواہیں روک دیں "تاکہ ملکی محاصل میں کمی کو پورا کیا جاسکے" اس کے بعد اس نے فوج کی بہت بڑی تعداد کی چھٹی کر دی۔ عربوں کی بہادری اور فوج کی کثرت کی وجہ سے تاتاریوں کو بغداد کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مگر علقمی، جو عباسی اقتدار کو ختم کر کے علوی اقتدار لانے کی خاطر تاتاریوں سے مل گیا تھا، اس نے جب ہلاکو خاں کو فوج کی کمی کی خفیہ خبر دی تو اس کی ہمت ہوگئی — اس نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کے بعد اتنے ظالمانہ طریقہ پر اس کو ختم کیا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاید انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی

بغداد کی تباہی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ جیل خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کو کھانا پانی بھی نہیں پہنچتا تھا۔ ایک روز بھوک پیاس سے بیتاب ہو کر خلیفہ نے ہلاکو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر دے۔ ہلاکو نے حکم دیا کہ خلیفہ کے محل سے جو بے شمار زر و جواہر حاصل ہوئے ہیں ان کا ایک طشت خلیفہ کے پاس لے جاؤ۔ خلیفہ نے جب زر و جواہر سے بھرا ہوا طشت دیکھا تو اس نے کہا: مجھے کھانے کی ضرورت ہے اور جواہرات کھائے نہیں جاسکتے (ان الجواھر لا تو کل) ہلاکو نے جواب دیا: جب زر و جواہر تمھاری بھوک نہیں مٹا سکتے تو تم نے کیوں نہ ایسا کیا کہ یہ جواہرات تم اپنی فوج کو دیتے اور ان کے ذریعہ اپنے ملک کے دفاع کا انتظام کرتے۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ اس کو اسی بھوک پیاس کی حالت میں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ذلت کے ساتھ مار ڈالا گیا۔

تاریخ میں اس طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو انسان کو سبق دے رہے ہیں کہ وہ حرص اور حق تلفی کا طریقہ چھوڑ دے اور قناعت اور انصاف پسندی کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے ان واقعات سے اپنے لئے کوئی سبق سیکھا ہو۔

روحیں منتظر ہیں

کریٹ (Crete) یونان کا ایک جزیرہ ہے۔ یہاں ۱۶۶۹ میں ترکوں کا قبضہ ہوا۔ اس کے بعد یونانیوں اور ترکوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار ۱۸۹۸ء میں کریٹ سے ترک اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ اس بنا پر ترکوں کی تاریخ میں کریٹ کے واقعات کا تذکرہ بھی لازمی طور پر شامل رہتا ہے۔

محمد حفیظ اللہ قریشی مرحوم نے ۱۹۲۲ میں لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا "تاریخ سلاطین آل عثمان"۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں خاندان عثمانیہ (ترکوں) کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ اس میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدا سے لے کر سلطان عبدالمجید ثانی کی معزولی تک کے حالات مختصر طور پر درج ہیں۔ کریٹ کے ساتھ ترکوں کی جنگ کے حالات لکھتے ہوئے کتاب میں بتایا گیا ہے:

۱۰۶۶ھ میں بندقیہ والوں کا ایک عیسائی امیرالبحر مع ۳۰ سپاہیوں کے سلطان محمد خاں رابع (۱۰۹۹–۱۰۵۹ھ) سے آملا۔ اور آستانہ (ترکی) میں آکر اس نے صدق دل سے مذہب اسلام قبول کرلیا۔ چنانچہ سلطان نے اس کی قدر افزائی کی۔ اور اس کو کارخانہ جہاز سازی کا نگراں بنادیا۔ اس نے اپنی حسن کارگزاری سے سلطان کو ہی خوش نہیں کیا بلکہ اسلام کی بے حد خدمت بجالایا اور اپنے گزشتہ گناہوں کی تلافی مافات کردی۔ (صفحہ ۱۰۶–۱۰۵)

اسلامی تاریخ میں اس طرح کے واقعات بہت ملتے ہیں کہ عین جنگ کے زمانہ میں دشمن کے افراد نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ عین ہنگامہ کارزار میں دشمن کی صف کو چھوڑ کر اہل اسلام کی صف میں شامل ہوگیے۔ ان واقعات سے اسلام کی تسخیری طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ اپنے اندر ہر آدمی کے لیے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ ہر آدمی کے دل میں اسلام کی طلب چھپی ہوئی ہے۔ ہر روح اس انتظار میں ہے کہ کب موقع ملے اور وہ خدا کی ابدی دنیا میں داخل ہوجائے۔ اسلام کی یہ تسخیری طاقت اتنی زبردست ہے کہ جنگ بھی اس کے لیے رکاوٹ نہیں۔ عداوت کی فضا بھی اس کی راہ میں حائل نہیں۔

تاریخ سے

راجر دوم (۱۰۹۵-۱۱۵۴) سسلی کا بادشاہ تھا۔ وہ نارمن سلطنت کا بانی تھا۔ قرون وسطیٰ کے مغربی بادشاہوں میں اس کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کا دارالسلطنت پلرمو (Palermo) تھا۔ راجر دوم نے سسلی کو ایک خوش حال ملک بنا دیا۔ ایک مضبوط انتظامیہ قائم کی۔ طاقت ور بحری بیڑہ تیار کیا۔ راجر دوم کو یہ کامیابی، ایک مغربی مورخ کے الفاظ میں، اس لیے ملی کہ اس نے سسلی کو یورپی اور عربی علمار کا مرکز بنا دیا تھا:

Roger made Sicily a meeting place of European and Arabic scholars. (VIII/634)

الادریسی اسی راجر دوم کا ہم عصر تھا۔ وہ مراکش میں پیدا ہوا۔ اس نے اسپین کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے سفر کیے۔ وہ علم جغرافیہ میں اپنے وقت کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ راجر دوم نے الادریسی کو سسلی بلایا تاکہ اس کے لیے وہ دنیا کا ایک نقشہ بنائے۔ الادریسی راجر دوم کا ایک قریبی دوست اور مشیر تھا۔ سسلی کے اس نارمن بادشاہ کے دربار میں الادریسی سرکاری جغرافیہ داں کے طور پر رہا:

Al-Idrisi was a close friend and adviser to Roger II, at whose court he served as official geographer. Roger II invited Al-Idrisi to Sicily to make a map of the world for him. (9/198)

گزرے ہوئے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اونچا مقام ملا اور انھوں نے ساری دنیا میں اسلام کا جو غلبہ قائم کیا، اس کا راز یہی تھا۔ یہ عظمت انھیں نہ احتجاج اور مطالبہ سے ملی اور نہ تیر اور تلوار سے یہ عظمت انھیں صرف اس لیے ملی کہ وہ دنیا کے لیے مفید بنے۔ انھوں نے علوم وفنون میں اتنی ترقی کی کہ وہ دنیا کے فکری امام بن گئے۔ انھوں نے صدیوں تک انسانیت کی علمی رہنمائی کی۔ انھوں نے دنیا کو وہ دیا جو دنیا کے پاس موجود نہ تھا۔ یہی امامت کا راز ہے ماضی کے لیے بھی اور حال اور مستقبل کے لیے بھی۔

اسلامی انقلاب کا اثر

مغل شہنشاہ جہانگیر (۱۶۲۷ - ۱۵۶۹) کا واقعہ ہے جس کو مولانا شبلی نعمانی نے نہایت موثر انداز میں نظم کیا ہے۔ ان کی یہ تاریخی نظم "عدل جہانگیری" کے عنوان سے ان کے مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ اس واقعہ کے مطابق جہانگیر کی محبوب ملکہ نور جہاں نے ایک شخص کو بلاسبب طپنچہ مار کر قتل کر دیا۔ یہ معاملہ شرعی مفتی کے سامنے پیش ہوا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں :

مفتیِ شرع نے بے خوف وخطر صاف کہا   شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

مفتی کے اس فتوی کے بعد نور جہاں، جہانگیر اور تمام درباری اپنے کو بے دست وپا محسوس کرنے لگے۔ بظاہر اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ نور جہاں کو اس جرم کی سزا دی جائے اور مقتول کے بدلے اس کو قتل کر دیا جائے۔ آخر کار مقتول کے ورثاء دیت لینے پر راضی ہو گئے اور اس طرح نور جہاں کی جان بچ گئی۔ کیوں کہ :

خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن

بعد کے زمانہ میں جب کہ اسلام کی تاریخ میں بادشاہوں کا دور شروع ہو گیا، اس قسم کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سلطانوں کے دربار میں وقت کے علماء ان کی مرضی کے خلاف اسلام کے مسائل بیان کرتے تھے اور کسی سلطان کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے مقابلہ میں انکار اور سرکشی کا مظاہرہ کر سکے۔

اس کی وجہ اسلامی انقلاب کی شدت ہے۔ رسولؐ اور اصحاب رسول کے ذریعہ تاریخ میں جو انقلاب آیا وہ اتنا گہرا اور اتنا شدید تھا کہ ظاہری سطح پر تبدیلیوں کے باوجود مسلم معاشرہ سے کبھی اس کی چھاپ ختم نہ ہو سکی۔ ظالم سلاطین کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کھلے طور پر وہ اسلام اور قرآن کے حکم کی خلاف ورزی کریں۔

تاہم ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ حکمرانوں کے اندر اس مزاج کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے مگر ان کے اقتدار سے ٹکراؤ نہ کیا جائے۔ کلمۂ حق کی حد پر رہنے سے یہ روایت باقی رہتی ہے اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کرنے سے یہ روایتی حد ٹوٹ جاتی ہے۔

ٹوٹا ہوا پتھر

لال قلعہ کی سیر کرنے والا جب اس کی بلند و بالا عمارتوں سے گزر کر اس کے "میوزیم" میں پہنچتا ہے تو وہاں جو چیزیں اسے دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں سے ایک وہ ٹوٹا ہوا پتھر ہے جو وسیع ہال کے ایک کونے میں رکھا ہوا ہے۔

اس پتھر پر قدیم زمانہ کے کسی "خاص محل" کا قطعہ تاریخ کندہ ہے جو مغل بادشاہ نے ۱۶۴۲ء میں بنوایا تھا۔ مگر یہ خاص محل آج کہیں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ پتھر دہلی کے پرانے قلعہ میں پڑا ہوا پایا گیا تھا۔ وہاں سے اٹھا کر اس کو لال قلعہ کے میوزیم میں دوسری تاریخی چیزوں کے ساتھ رکھ دیا گیا۔

اس ٹوٹے ہوئے پتھر پر جو فارسی قطعہ عمدہ کتابت کے ساتھ درج ہے اس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

ہمیشہ باد بزیر سپہر بوقلموں

یعنی "خاص محل" تعمیر کرانے والے بادشاہ کی سلطنت آسمان کے نیچے ہمیشہ قائم رہے۔ مگر آج نہ خاص محل ہے اور نہ اس کا بنانے والا بادشاہ۔ اور نہ اس شاعر کا کہیں وجود ہے جس نے بادشاہ اور اس کے محل میں دائمی عظمت کا نشان دیکھا تھا۔ صرف ایک ٹوٹا ہوا پتھر اس بات کی یادگار کے طور پر باقی ہے کہ تین سو برس پہلے اس ملک میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا کہ بادشاہ نے اپنی عظمت و اقتدار کے نشان کے طور پر ایک محل بنایا اور وقت کے فن کار نے منظوم الفاظ میں اس کی تصدیق کی۔ اور پھر اس لفظی تصدیق کو پتھر کی تختی پر کندہ کر دیا گیا۔

جب بھی کسی کو زمین پر اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ باقی رہے گا۔ وہ وقتی واقعہ کو مستقل واقعہ سمجھ لیتا ہے۔ مگر زمانہ نے کبھی کسی حکمراں کے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اگلا حکمراں جو پچھلے حکمراں کے محل کے "ٹوٹے ہوئے پتھر" کو میوزیم میں رکھتا ہے وہ دوبارہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ زمین پر باقی رہے گا۔

دنیا کا سب سے زیادہ عام واقعہ یہ ہے کہ آدمی پر موت آتی ہے۔ وہ عروج و زوال کے قانون کا شکار ہوتا ہے۔ مگر آدمی اس سب سے زیادہ عام بات سے سب سے کم نصیحت لیتا ہے۔ شاید اس سے زیادہ انوکھی بات اس زمین پر اور کوئی نہیں۔

ہر زندگی جو آج شاندار اور کامیاب دکھائی دیتی ہے وہ کل ایک "ٹوٹا ہوا پتھر" بن جاتی ہے۔ ہر پھول مرجھاتا ہے اور ہر مکان کھنڈر بن جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ہجوم میں وہ اپنے بارے میں یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس کا پتھر کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

جب جھٹکا لگتا ہے

ابتدائی زمانہ کے ترک سلطان بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ دربار میں بھی کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا اور اس نے ترک سلاطین کے انداز کو بالکل بدل دیا۔

سلطان محمد ثانی (۱۴۸۱ - ۱۴۵۱) وہ ترک حکمراں ہے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کے بعد سلطان محمد فاتح کے عظیم نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے وزیروں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثنا میں ایک کسان کوئی فریاد لے کر حاضر ہوا۔ یکساں قسم کے لوگوں کے درمیان وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا :

تم میں سے سلطان کون ہے

سلطان محمد فاتح نے ایک دیہاتی کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو وہ اس کو بہت ناگوار گزرے۔ اس نے محسوس کیا کہ دیہاتی نے بھرے مجمع میں اس کی توہین کر دی۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے محل کے اندر چلا گیا۔ اس کی سادہ مزاجی پر اس کا احساس سلطانی غالب آ گیا اور اس کے بعد سے اس نے وزیروں اور درباریوں کی مجلس میں بیٹھنا بند کر دیا۔

سلطان نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ لوگوں سے الگ ایک دریچہ کے پیچھے بیٹھتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے وزیروں کی باتیں یا لوگوں کی درخواستیں سنتا۔ دھیرے دھیرے مزید تبدیلی آئی اور بعد کو یہ اصول بھی باقی نہ رہ سکا۔

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶ - ۱۵۲۰) کے دور سے ایسا ہوا کہ سلاطین ترکی نے وزیروں کی مجلس میں شرکت بالکل بند کر دی۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وزراء کی مجلس صدر اعظم کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مشورہ کرتی اور اس کے بعد وہ جس فیصلہ تک پہنچتی اس کو صدر اعظم سلطان تک پہنچا دیتا۔ سلطان اس کو سن کر اپنا حکم سنا دیتا جو اس باب میں آخری ہوتا۔

آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ عام حالات میں بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ مگر جب اس کے نفس کو کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اچانک وہ بدل جاتا ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو غیر معمولی حالات میں بھی درست رہے۔ جھٹکا لگنے کے بعد بھی جس کے اندر تبدیلی نہ آئے۔

تصوّرِ دین

تکبیرِ رب

قرآن میں مویشیوں کا اور قربانی کے اونٹوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ان جانوروں کو خدا نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ کی ہدایت پر تم اس کی بڑائی کرو (کَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، الحج ۳۷)

انسان بھیڑیئے اور ریچھ کو اپنا خدمت گار نہیں بنا سکتا۔ مگر بیل اور اونٹ سے وہ مختلف قسم کی خدمت لیتا ہے۔ یہ تسخیر کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ جن جانوروں کو مویشی کہا جاتا ہے، ان کے اندر جبلی طور پر یہ مزاج ہے کہ وہ انسان کے تابع بن جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مویشیوں سے کام لینا بھی اتنا ہی دشوار ہوتا جتنا وحشی جانوروں سے کام لینا دشوار ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ کے اس تخلیقی کرشمہ کو جانے اور اس پر شکر گزاری سے اس کا دل لبریز ہو جائے۔ اللہ کا ایک بندہ جب اللہ کے نام پر جانور کی قربانی کرتا ہے تو یہ گویا اس کے دل کی کیفیت کا ایک خارجی اظہار ہوتا ہے۔ وہ گویا عمل کی زبان میں کہتا ہے کہ خدایا، تو نے اگر ان حیوانات کو ایسا نہ بنایا ہوتا تو میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ان کو اپنے لیے مسخر کر سکوں۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کا ہے۔ ہر چیز انسان کے لیے خدا کی نعمت ہے۔ ہر چیز اسی وجہ سے انسان کے لیے قابلِ استعمال ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ ہر چیز کا تقاضا ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان کے اندر خدا کی عظمت کا احساس جاگ اٹھے۔ اس کا سینہ خدا کی بڑائی کے جذبے سے سرشار ہو جائے۔ یہی تکبیرِ رب ہے۔ تکبیرِ رب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی فعل ہے۔ اسی معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳) اور وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (الاسراء ۱۱۱)

تکبیرِ رب در اصل معرفت کا ایک بھونچال ہے جو مومن کے اندرونی وجود میں برپا ہوتا ہے۔ یہ ایک شخصیت کا عرفانِ خداوندی سے پھٹ پڑنا ہے، اور اللہ اکبر کا کلمہ اسی پھٹ پڑنے کا ایک لفظی اظہار۔

اصل اور تفصیل

بیج ایک بہت چھوٹا دانہ ہے۔ اس سے ایک بہت بڑا درخت نکلتا ہے۔ اس بیج اور اس درخت میں جو باہمی نسبت ہے وہ محدود اور مکمل کی نہیں ہے بلکہ اصل اور تفصیل کی ہے۔ درخت اپنے بیج کی تفصیل ہے نہ یہ کہ اس نے محدود کو مکمل کیا ہے۔

یہی معاملہ فکر اور عمل کا ہے۔ فکر آدمی کے اندر ہے اور اس کے اعمال بے شمار صورتوں میں اس کے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر انسان کے فکر اور انسان کے عمل کے درمیان محدود اور مکمل کی نسبت نہیں۔ یہاں دوبارہ اصل اور تفصیل کی نسبت ہے۔ انسان کے پھیلے ہوئے اعمال اس کے فکر کی تفصیل ہیں نہ کہ وہ محدود کو مکمل کر رہے ہیں۔

اسی طرح خدا کے دین کی بھی ایک اصل ہے، اور ایک اس کی تفصیل۔ خدا کے دین میں اصل کی حیثیت توحید کو حاصل ہے۔ اس کے سوا جو دینی احکام ہیں وہ سب اسی اصل کی تفصیل ہیں۔ عقیدۂ توحید اور احکامِ شریعت میں اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ یہ عقیدہ کی تصغیر ہے کہ اس کو محدود اور مسائل و احکام کو مکمل کہا جائے۔

قرآن میں بہ مشکل چند سو احکامی آیتیں ہیں۔ مگر فقہ کو دیکھیے تو اس میں آپ کو ئی لاکھ احکام ملیں گے۔ کیا قرآن محدود ہے اور فقہ اس کے مقابلہ میں مکمل ہے۔ نہیں۔ قرآن اور فقہ کا معاملہ بھی وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ قرآن اصل ہے اور فقہ اس کی تفصیل ہے۔

ایمان و اسلام کو قرآن میں درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسلام سب سے پہلے دل کی زمین میں جڑ پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ آدمی کی خارجی زندگی میں پھیلتا ہے۔ اسی طرح اسلام پہلے فرد کے اندر قائم ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اجتماع میں ظہور کرتا ہے۔ گویا انفرادی دین اصل ہے اور اجتماعی دین اس کی تفصیل۔

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ خدا کی دنیا میں ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ اس دنیا میں جس نے بیج لگایا اس نے درخت لگایا، اور جس نے درخت لگایا اس نے کچھ بھی نہیں لگایا۔

بے ترتیب نماز

ایک آدمی اگر ایسا کرے کہ وہ نماز پہلے پڑھ لے اور وضو اس کے بعد کرے تو ایسے آدمی کو نماز پڑھنے والا نہیں کہا جائے گا۔ شریعت کی نظر میں وہ ایک سرکش آدمی ہے نہ کہ نمازی آدمی۔ اگر کوئی آدمی اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے تو اگرچہ وہ بظاہر نماز کے تمام اجزاء کو دہرا رہا ہوگا، مگر اس کی بے ترتیبی اس کی نماز کو باطل کر دے گی۔ شریعت کبھی اس کو نمازی تسلیم نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں ایک بلین مسلمان ہیں، مگر ایسا کوئی مسلمان نہیں ملے گا جو اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھتا ہو۔ کیوں کہ وہ نماز کے معاملہ میں اس مسئلہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ خدا کے یہاں ایسی بے ترتیب نماز کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر ایک اور معاملہ میں بے شمار انسان اسی قسم کی "نماز" پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے نماز پڑھ لیں، پھر اس کے بعد وضو کریں۔ شریعت الٰہی سے اس انحراف کے باوجود بہت سے مسلمان ان کو اسلامی ہیرو سمجھتے ہیں اور ان کو مجاہد کا خطاب دیئے ہوئے ہیں۔

یہ مسلمان وہ ہیں جو اپنے اعلان کے مطابق، اسلامی حکومت یا اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے آپ نے لمبی مدت تک تربیتی جدوجہد کر کے لوگوں کا ذہن بنایا۔ اس کے بعد اسلام کے قانون کو لوگوں کے اوپر نافذ کیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مجاہدینِ اسلام اس کے برعکس یہ چاہتے ہیں کہ پہلے حکومت پر قبضہ کریں، اس کے بعد افراد کا ذہن بنانے کا کام کریں۔

ان کا کہنا ہے کہ پہلے ملک حاصل کرو، اس کے بعد اسلامی زندگی کی تعمیر کرو۔ پہلے فاسد حکمراں کو ہلاک کرو، اس کے بعد صالح قیادت پیدا کرنے کی محنت کرو۔ پہلے سینما ہاؤس کی عمارت کو توڑو، اس کے بعد سینما بینی کا مزاج ختم کرو۔ پہلے سیاسی تبدیلی لے آؤ، اس کے بعد افراد کا ذہن بدلو۔ پہلے وزارت اعلام پر قبضہ کرو، اس کے بعد وسائل اعلام کو اسلام کی اشاعت کے لیے استعمال کرو۔ وغیرہ

اس قسم کی تمام کارروائیاں "پہلے نماز اور اس کے بعد وضو" کی مصداق ہیں۔ نماز کی ترتیب بدلنے کے بعد نماز نماز نہیں رہتی، اسی طرح اسلامی تحریک کی ترتیب اگر بدل دی جائے تو ایسی اسلامی تحریک بھی اس کے بعد اسلامی تحریک باقی نہیں رہے گی۔

فریضۂ شہادت

موجودہ دنیا میں امت محمدؐ کا اصل منصبی فریضہ شہادت علی الناس ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ انتم شہداء اللہ فی الارض (تم لوگ زمین پر اللہ کے گواہ ہو)

قرآن کے مختلف مقامات کو ملا کر دیکھنے سے شہادت کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں انسان کو آزمائش کے لیے رکھا ہے، اس بات کی آزمائش کے لیے کہ وہ حق کا اعتراف کرتا ہے یا نہیں۔ اور اپنی زندگی کو حق کے مطابق ڈھالتا ہے یا نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ انتہائی سنگین بات ہے۔ کیوں کہ اسی کی بنیاد پر آخرت میں انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اسی امتحان کی بنیاد پر کچھ لوگ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے اور کچھ لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اس عمل کا دوسرا نام دعوت اور تبلیغ ہے۔ اس کو شہادت (گواہی) اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے دعاۃ آخرت میں خدا کے شہداء (گواہ) ہوں گے۔ جن خدا کے بندوں نے دنیا میں خدا کے سچے دین سے لوگوں کو باخبر کیا ہوگا وہی آخرت کی عدالت میں قوموں کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہوں گے اور بتائیں گے کہ دعوتِ حق کا ردعمل کس نے اقرار کی صورت میں پیش کیا اور کس نے انکار کی صورت میں۔

نُصرت اور غلبہ کا وعدہ جو امت مسلمہ سے کیا گیا ہے وہ تمام تر اسی عمل کی ادائیگی پر موقوف ہے۔ مسلمان کارِشہادت انجام دیں تو وہ دنیا میں سربلند ہوں گے۔ اوراگر وہ کارِشہادت انجام نہ دیں تو کوئی چیز انھیں ذلت اور ناکامی سے بچا نہیں سکتی۔

کسی آدمی کی زندگی کا جو مقصد ہو اسی کے لحاظ سے اس کا پورا کردار بنتا ہے۔ مسلمان اگر دل سے یہ سمجھیں کہ ان کا اصل کام قوموں کے اوپر خدا کے دین کی گواہی دینا ہے تو ان کا پورا رویہ بدل جائے گا۔ اس کے سوا دوسری تمام باتیں انھیں غیر متعلق نظر آنے لگیں گی۔ دوسری قوموں سے وہ اپنے دنیوی جھگڑے ختم کر دیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ یک طرفہ نقصان اٹھا کر دوسری قوموں سے معتدل تعلقات قائم کریں تاکہ انھیں خدا کے دین پر سنجیدہ غور و فکر کے لیے آمادہ کر سکیں۔

نزولی تکمیل نہ ارتقائی تکمیل

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے میں دین اسلام پر راضی ہو گیا۔

اس آیت میں اکمال دین سے مراد علی الاطلاق دین خداوندی کی تکمیل نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے ان کے دین کی تکمیل ہے۔ یہاں اکمال کا مفہوم وہی ہے جس کے لئے انگریزی میں to conclude کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کے نام سے خدا کی جو عربی کتاب جزء جزء کر کے اتر رہی تھی اور ۲۳ سال تک اترتی رہی، اب اس کا آخری جزء آ گیا اور قرآن کے نزول کی تکمیل ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانیت کے ابتدائی زمانہ سے جو دین اترنا شروع ہوا، وہ ارتقائی سفر کرتے کرتے اب اپنی آخری تکمیلی صورت میں نازل کر دیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں قرآن عربی کی نزولی تکمیل مراد ہے نہ کہ علی الاطلاق دین خداوندی کی ارتقائی تکمیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی آیت (المائدہ ۳) میں الیوم اکملت لکم دینکم (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ ہیں نہ کہ الیوم اکملت الدین (آج میں نے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ۔ آیت کے یہ الفاظ انکار کرتے ہیں کہ اس سے مطلق معنوں میں دین کا مکمل کیا جانا مراد لیا جائے۔

اللہ کی کتاب ہدایت اصلاً ایک ہی ہے جس کو قرآن میں ام الکتاب کہا گیا ہے۔ مختلف انبیاء پر جو کتابیں اتریں وہ اسی ام الکتاب کے اڈیشن تھے۔ ایک کتاب اور دوسری کتاب میں جو فرق ہے وہ زبان اور اسٹائل کا ہے نہ کہ ناقص اور کامل کا۔

تاہم پیغمبر آخر الزماں کے بعد اب نجات کا ذریعہ صرف قرآن اور اسلام ہے۔ پچھلی کتابیں یا پچھلا مذہب اب کسی کے لئے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے محفوظ اور غیر محفوظ کا فرق۔ قرآن اپنی اصل ابتدائی حالت میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی دوسری کتابیں اپنی اصل حالت پر محفوظ نہیں۔ قرآن اور دوسری کتابوں کا یہ فرق تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے۔ اس میں علمی طور پر کسی قسم کے شبہہ کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب کا جو اڈیشن محفوظ حالت میں موجود ہو وہی لوگوں کے لئے ہدایت اور نجات کا ذریعہ بنے گا نہ کہ وہ کتابیں جن میں انسانوں نے تحریف کر ڈالی ہے۔ جو اپنی اس اصل حالت پر محفوظ ہی نہیں جس پر خدا نے انھیں اتارا تھا۔

ناقص تشریح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مشہور مصنف لکھتے ہیں: "عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز، روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرماں برداری اور نیازمندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجالانا، کسی اور سے تقویٰ کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے"

مذکورہ تشریح میں عبادت کو چار چیزوں کا مجموعہ بتایا گیا ہے ـــــ پرستش، اطاعت، فرمانبرداری نیازمندی۔ محترم مصنف کے نزدیک یہ عبادت کا "پورا مفہوم" ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ پورا مفہوم اس کا صرف ناقص مفہوم ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ محبت نام ہے چار چیزوں کا: دل سے چاہنا، ملاقات کرنا، باتیں کرنا، ایک ساتھ کھانا۔ تو اس کو محبت کا ناقص مفہوم کہا جائے گا نہ کہ اس کا پورا مفہوم۔ کیوں کہ محبت چار چیزوں کا مجموعہ نہیں۔ محبت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہ دل سے چاہنا ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ محبت کے مظاہر ہیں نہ کہ محبت کے مجموعہ کے چار مساوی اجزاء۔

اسی طرح عبادت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں اپنے رب کا پرستار بن جائے۔ بقیہ جو چیزیں شریعت میں ہیں وہ اسی اصل عبادت کے مظاہر ہیں۔ وہ اس اصل عبادت کے پیدا ہونے کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر آدمی کی زندگی میں ظہور کرتی ہیں۔ اگر پرستاری ہوگی تو بقیہ چیزیں بھی ہوں گی، اور اگر پرستاری نہیں ہوگی تو یقینی طور پر بقیہ چیزیں بھی نہیں ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تشریح نے عبادت کے مفہوم کو محدود کر دیا، اگرچہ نادانی کی بنا پر محترم شارح یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اس کو جامع اور مکمل بنا لیا ہے۔

خدا کے نام پر

خدا بڑا ہے، اور کوئی بڑا نہیں ـــــ بظاہر صد فی صد خیر کی بات ہے۔ مگر یہ بظاہر خیر کی بات بھی عملاً شر کی بات بن جاتی ہے جب کہ آدمی نے اس کو صرف آدھی شکل میں دریافت کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا بڑا ہے، اس کے سوا کوئی بڑا نہیں۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چھوٹا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی چھوٹا نہیں۔ آدمی اگر ان دونوں باتوں کو جانے تو اس کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ صرف پہلی بات کو جانے اور دوسری بات کو نہ جانے تو اس سے اس کے اندر جو مزاج پیدا ہوگا اسی کا نام سرکشی ہے۔

شیطان کو معلوم تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ چنانچہ وہ ابدی طور پر شر اور فساد کا کارخانہ بن گیا۔ اسی طرح ہٹلر اس بات کو جانتا تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر وہ اس بات کو نہیں جانتا تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاریخ کا سب سے زیادہ سرکش اور مفسد انسان قرار پایا۔

"خدا بڑا ہے" کہنا ایک خارجی حقیقت کا اقرار کرنا ہے۔ اور "میں چھوٹا ہوں" کہنا اپنے آپ کو اس خارجی حقیقت کے مطابق ڈھالنا ہے۔ کچھ لوگ خدا کو ایک عظیم خارجی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اپنی ذات کو اس کے مطابق نہیں ڈھالتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے نام پر خود خدا بن جاتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لڑتے ہیں، حالاں کہ خدا کو بڑا ماننے کا تقاضا تھا کہ ان سے لڑائی کا ہر جذبہ چھن جائے۔ وہ لوگوں پر زبان درازی کرتے ہیں، حالاں کہ خدا کی خدائی کا احساس جس کے دل میں پیدا ہو جائے اس کے الفاظ اس سے گم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ لوگوں کو اپنی زبان درازی کا نشانہ بنائے۔

ہر حقیقت اس وقت تک آدھی حقیقت ہے جب تک آدمی اس کے مقابلہ میں خود اپنی حیثیت کو دریافت نہ کرے۔ خارجی حقیقت کی دریافت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کی نسبت سے آدمی اپنے واقعی مقام کو بھی جان لے۔ جس آدمی کو پہلی بات معلوم ہو، اور دوسری بات اس کو معلوم نہ ہو، اس کا سارا رویہ اس دنیا میں غلط ہو کر رہ جائے گا۔

اصل دین

ایک صاحب نے پرجوش طور پر لکھا ہے کہ "توحید صرف ذاتی عقیدہ یا انفرادی عبادت کا نام نہیں۔ اس سے بڑھ کر توحید یہ ہے کہ اللہ کی حکمرانی کو تمام انسانوں کے اوپر قائم کیا جائے۔ اللہ کے سیاسی اور اجتماعی قوانین کو سارے عالم میں غالب اور نافذ بنا دیا جائے"

بظاہر یہ ایک بے ضرر کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل لغو کلام ہے۔ وہ تحریفِ دین کی حد تک قابلِ اعتراض ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے عقیدہ کو محض اقرار اور عبادت کو صرف مراسم پرستش کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھا ہے۔ حالاں کہ یہ عقیدہ اور عبادت کی تصغیر ہے۔

عقیدہ سے مراد صرف تلفظ کلمہ یا اقرار لسانی نہیں ہے۔ عقیدہ ایک شعوری سفر کی منزل یا ایک ذہنی انقلاب کی تکمیل ہے۔ عقیدہ ایک عظیم ترین روحانی تجربہ ہے یہ اس ناقابلِ بیان ربانی حالت کا نام ہے جب کہ ایک بندہ حقیقتِ اعلیٰ کے سمندر میں نہاتا ہے، جب وہ ایک ابدی نور سے روشن ہو کر چمک اٹھتا ہے۔

اسی طرح عبادت کو صرف کچھ ظاہری مراسم کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھنا، عبادت سے سراسر ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ عبادت اس کائنات کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ عبادت اس لرزہ خیز لمحہ کا نام ہے جب کہ عاجزِ مطلق قادرِ مطلق سے ملاقات کرتا ہے۔ جب کہ ایک بااختیار انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے کو بے اختیار بنا لیتا ہے۔ جب وہ حقیقتِ واقعہ کا آزادانہ اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے۔ عبادت اس کائنات کے اس نادر ترین لمحہ کا نام ہے جب کہ ایک بندہ رب العالمین کے آگے ڈھ پڑتا ہے حالاں کہ وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ تھا۔

عقیدہ اور عبادت دین خداوندی کا جزء نہیں، وہ دینِ خداوندی کی اصل ہیں۔ جہاں یہ اصل موجود ہو وہاں لازماً دوسری تمام مطلوب چیزیں بھی موجود ہوں گی۔ جہاں یہ اصل نہیں وہاں بقیہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی پائی نہیں جاسکتی۔

اسلام کا مقصد

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام عملاً ایک ناکام نظام ہے کیوں کہ وہ تیس برس سے زیادہ نہیں چل سکا۔ میں نے کہا کہ اس اعتراض کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ ان نام نہاد اسلامی مفکرین سے ہے جنھوں نے اسلام کی غلط تعبیر کر کے اس کو ایک نظام کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اسلام کو جانچنے کا ایک غلط معیار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ یہ بات بذات خود غلط ہے کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ اس لیے اس معیار پر اسلام کو جانچنا بھی درست نہیں ہوسکتا۔

بات کو واضح کرنے کے لیے میں نے ان کے سامنے ایک مثال دی۔ میں نے کہا کہ آپ تبلیغی جماعت کو لیجئے۔ تبلیغی جماعت کے متعلق اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا مقصد نئی دہلی کی پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کرنا ہے تو آپ کو نظر آئے گا کہ تبلیغی جماعت ایک سراسر ناکام جماعت ہے کیوں کہ وہ پارلیمنٹ ہاؤس پر ایک فی صد بھی سیاسی قبضہ حاصل نہ کرسکی۔ لیکن اگر آپ تبلیغی جماعت کو جانچنے کا یہ معیار قائم کریں کہ اس کا مقصد لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈالنا ہے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغی جماعت ایک بے حد کامیاب جماعت ہے، کیوں کہ اس کی محنت نے لاکھوں لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈال دیا۔

میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض نام نہاد اسلامی مفکرین کے خود ساختہ نظریہ پر وارد ہوتا ہے نہ کہ خدا اور رسول والے اسلام پر۔

یہ بات بذات خود بالکل غلط ہے کہ اسلام کا مقصد حکومت قائم کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کو ربّانی انسان بنانا ہے۔ اسلامی جماعت کا صحیح نام جماعت ربانی ہے نہ کہ جماعت حکمرانی۔ اسلام کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسلام ایک ایک فرد کی اس فطرت کو جگانا چاہتا ہے جس پر اس کے خالق نے اسے پیدا کیا ہے، تاکہ انسان اپنے رب کو پہچانے، تاکہ وہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق قائم کرے، تاکہ وہ ایک آخرت پسند انسان بن جائے۔

دو قسمیں

ہر آدمی اپنی نفسیات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ کسی مسلمان کے اندر جس قسم کی نفسیات بنے گی، اسی کے مطابق اس کے تمام اعمال ظاہر ہوں گے۔ یہ نفسیات دو قسم کی ہو سکتی ہیں، ان کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

اسلام برحق ہے ، میں برحق ہوں

ان دو جملوں میں بظاہر صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ ایک فقرہ میں "اسلام" ہے، اور دوسرے فقرہ میں "میں"۔ مگر اسی معمولی فرق میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔ مسلمان جب ایک زندہ گروہ ہوں تو وہ اسلام کو برحق سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ تنزل کا شکار ہوں تو اپنے آپ کو برحق۔ پہلے تصور سے خوفِ خدا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرے تصور سے جھوٹے احساس برتری کا۔

اسلام بلاشبہ سب سے زیادہ سچا دین ہے۔ جب کسی آدمی پر اس کی سچائی منکشف ہوتی ہے تو اس کے اندر زبردست انقلاب آجاتا ہے۔ وہ اعلیٰ اخلاقیات کا پیکر بن جاتا ہے۔ وہ اسلام کو تمام انسانوں تک پہونچانے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ ارشمیدس کو صرف پانی کا ایک قانون دریافت ہوا تھا۔ اس سے وہ اتنا بے خود ہوا کہ حوض سے ننگا نکل پڑا، اور یوریکا، یوریکا (میں پاگیا، میں پاگیا) کہتا ہوا باہر بھاگا۔ پھر کائنات کی سب سے بڑی سچائی جس کو مل جائے اس کا حال کیا ہوگا۔

معرفت کے طور پر ملنے والا اسلام براہ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کے اندر وہ صفات ابھرتی ہیں جو خدا کو دیکھنے اور اس کا تجربہ کرنے والے کسی شخص کے اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ وہ عظمتِ خداوندی سے کانپ جاتا ہے۔ خدا کے کمالات کا احساس اس سے سرکشی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص کو دین خاندانی اثاثہ کے طور پر ملے، اس کو وہ قومی فخر یا خاندانی اعزاز کے ہم معنی سمجھ لے گا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ہم نے جھوٹے فخر کا نام دیا ہے۔

سمندر کا پانی اڑ جائے تو اس میں صرف نمک ہی نمک رہ جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ ان کے دین سے جب خدا کا خوف نکل جائے تو اس کے بعد وہ صرف نمک بن کر رہ جاتا ہے جس کا ذائقہ لوگوں کو بدمزہ کر دے۔

مقبول دین

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور قیامت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا (ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین)

عام طور پر اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اسلام آخرت میں نجات کا ذریعہ اس لیے بنے گا کہ وہ سب سے کامل دین ہے۔ اس کا رسول سب سے افضل رسول ہے۔ اس کی کتاب سب سے زیادہ بابرکت کتاب ہے۔ آیت کی یہ تفسیر قرآنی تفسیر نہیں۔ یہ ایک مضبوط بات کو کمزور دلیل سے ثابت کرنا ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ خدا اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں (ان الله لیس بظلام للعبید) مذکورہ تفسیر قرآن کے اس بیان کی تردید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسانی نسل کے ایک حصہ اور دوسرے حصہ کے درمیان فرق کیا ہے پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے پیدا ہونے والوں کو اس نے کم تر درجہ کا دین دیا اور جو لوگ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد پیدا ہوئے ان کو برتر دین عطا فرمایا۔ یہ بات یقینی طور پر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ خدا اپنی رحمت کی تقسیم میں کبھی ایسا امتیاز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نجات کا ذریعہ اس لیے ہے کہ اب وہی ایک محفوظ دین ہے۔ پچھلے دور میں آنے والے دین بھی اپنے زمانہ میں اتنا ہی مقبول دین تھے جتنا کہ اسلام آج مقبول دین ہے۔ مگر جب ان کی آسمانی کتابوں میں تحریف ہو گئی۔ ان کے حاملین نے ان میں کمی بیشی کر دی تو اب وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ نہ رہے۔ اسلام مکمل طور پر ایک محفوظ دین ہے اس لیے وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر پچھلے تمام دین بعد کے زمانہ میں رد کر دیئے گئے اور صرف اسلام ہدایت کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رہا۔

اسلام اور دوسرے ادیان میں اصلی فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ ہے اور دوسرے ادیان غیر محفوظ۔

تجلّیاتِ حق

تخلیق کا مقصد

یہ دنیا جس میں ہم ہیں، اس کو اگر بامقصد دنیا سمجھا جائے تو اس سے آدمی کے اندر یہ احساس ابھرے گا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق بنائے۔ اسی کا نام ذمہ دارانہ زندگی ہے۔ اور ذمہ دارانہ زندگی کا احساس ہی تمام انسانی خوبیوں کا اصل محرک ہے۔

اس کے برعکس اگر موجودہ دنیا کو بے مقصد دنیا فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد یہ احساس بھی مٹ جاتا ہے کہ ہم سے اوپر کوئی مقصد ہے، اور ہم کو اسی مقصد سے مطابقت کر کے اس دنیا میں رہنا ہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر بے قید آزادی کا ذہن وجود میں آتا ہے، اور بے قید آزادی کا مزاج بلاشبہ تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے کون سی بات ہے جو انسانی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اور جو کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ اس حیثیت سے جب غور کیا جائے تو بلا تاخیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک بامقصد منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ بے مقصدیت کا نظریہ کائنات کے مجموعی نظام میں درست نہیں بیٹھتا، اس لیے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

انسانی فطرت چاہتی ہے کہ اچھے عمل کا اچھا انجام ہو اور برے عمل کا برا انجام۔ اگر کائنات کو بامقصد نہ مانا جائے تو انسانی فطرت یہاں بالکل بے جواب ہو کر رہ جائے گی۔ کائنات کو بے مقصد قرار دینا گویا انسان کو ایک ایسی دنیا رہنے کے لیے دینا ہے جو اس کے گہرے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اسی طرح کائنات کا وسیع تر نظام حد درجہ بامعنی انداز میں قائم ہے۔ انسان سورج کو خدا کہتا ہے مگر سورج ڈوب کر اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ انسان تکبّر کرتا ہے مگر اس پر موت آکر اس کے اس قسم کے تمام دعووں کو باطل کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کسی بے مقصد توجیہ کو قبول نہیں کرتی۔ اس دنیا میں وہی نظریہ صحیح نظریہ ہے جو انسان کو مقصدیت کا احساس عطا کرے۔

کائنات کا سبق

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان خدا کی حمد کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اور اس کے کلمات کو نمایاں کر رہے ہیں۔ یہ انتظام اس لیے ہے تاکہ انسان ان سے سبق لے، تاکہ وہ اپنے آپ کو کائناتی قافلہ کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔

زمین و آسمان کس زبان میں خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ چپ کی زبان میں۔ خدا اپنی کائنات میں چپ کی زبان میں بول رہا ہے۔ وہ واقعات کی زبان میں ہم سے ہم کلام ہے۔ اب جو لوگ صرف شور کی زبان سننا جانتے ہوں، وہ خدا کا پیغام سننے سے محروم رہیں گے۔

درخت کو دیکھئے۔ ایک ہی مکمل وجود ہے مگر اس کی جڑیں نیچے زمین کی طرف جاتی ہیں اور اس کا تنہ اوپر فضا کی طرف بلند ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز میں دو متضاد خصوصیات کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی چوکنا ہو۔ تاکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو سکے۔ اس طرح آدمی کو چوکنا کر کے درخت یہ سبق دے رہا ہے کہ بلندی حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے نچلی سطح پر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرو۔

ہر چیز جو زمین پر کھڑی ہوئی ہو اس کا سایہ ہمیشہ نیچے پڑتا ہے۔ اصل اوپر اور سایہ نیچے کیوں۔ انسان کے اندر کھوج پیدا کرنے کے لیے تاکہ وہ سوچے۔ جب آدمی قدرت کے اس منظر پر سوچے گا تو اس پر یہ کھلے گا کہ زندگی کا سب سے اہم راز یہ ہے کہ ظاہری طور پر خواہ تم کو کتنی ہی بلندی حاصل ہو جائے، اپنے اندرونی وجود کو ہمیشہ متواضع رکھو۔

سمندر کو دیکھئے۔ سمندر کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ مگر یہی سمندر جب اپنے پانی کو بارش کی صورت میں انسانوں کے لیے برساتا ہے تو وہ میٹھا پانی بن جاتا ہے۔ سمندر اور اس کی بارش میں یہ فرق کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر سوچے۔ جب آدمی سوچے گا تو اس پر یہ حقیقت کھلے گی کہ تمہارے سینے میں خواہ تلخ جذبات امنڈ رہے ہوں مگر جب تم اپنے احساسات کو باہر نکالو تو اس کو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی مانند بنا کر نکالو۔

کائنات خدا کا سبق ہے، مگر وہ سبق اس کے لیے ہے جس نے اپنے کان اور آنکھ کو کھلا رکھا ہو۔

جنّت ، جہنّم

عن ابی هُریرةَ ، قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : ما رأیتُ مثلَ النارِ نام هاربُها وما رأیتُ مثلَ الجنةِ نام طالبُها۔ (رواہ الترمذی)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے جہنّم جیسی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا سوگیا ہو۔ اور میں نے جنّت جیسی چیز نہیں دیکھی جس کا چاہنے والا سوگیا ہو۔

آدمی کو سب سے زیادہ جہنّم سے بھاگنا چاہیے۔ مگر آدمی جہنّم کے مسئلہ کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی کو سب سے زیادہ جنّت کا طالب بننا چاہیے، مگر اس کے اندر جنّت کو حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ یہی دو لفظ میں تمام انسانوں کی کہانی ہے۔

انسانوں کا یہ حال کیسا عجیب ہے۔ لوگ احساس کے درجہ میں بھی جہنّم سے اندیشہ ناک نہیں۔ لوگ تمنّا کے درجہ میں بھی جنّتِ خداوندی کے طالب نہیں۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جہنّم کی آگ سے نجات پائیں اور ان کے لیے جنّت کی نعمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔

لوگوں کے اندیشے کسی اور چیز کے لیے ہیں۔ ان کے جذبات کسی اور بات پر بھڑکتے ہیں۔ ان کے اندر چھپے ہوئے خوف اور امید کے جذبات کسی اور چیز کے لیے وقف ہیں۔ ایسی حالت میں کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں۔

مسئلۂ دنیا کو لوگوں نے اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسئلۂ آخرت کو کسی نے اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔ دنیا کی دولت، دنیا کی قیادت، دنیا کی مقبولیت، دنیا کی نیک نامی، یہی سب چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز ہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی نہیں جو آخرت کی بخشش اور آخرت کی نجات کے معاملہ میں فکرمند ہو۔ آخرت کے عذاب کا خوف اور آخرت کی جنّت کی حرص جس کو سراسیمہ بنا دے۔

آہ وہ دنیا، جہاں سب کچھ ہو، مگر وہی چیز نہ ہو جس کو سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔ آہ وہ انسان، جو سب کچھ جانے، مگر وہی بات نہ جانے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی بھول ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ آدمی اپنی اس بھول کو جانے گا۔ مگر وہ جاننا صرف حسرت کے لیے ہوگا نہ کہ کھوئے ہوئے کی تلافی کے لیے۔

کچھ نہیں

سولہواں لوئی (Louis XVI) فرانس کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ ۱۷۵۴ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۹۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں فرانس کا جمہوری انقلاب (۱۷۸۹) آیا۔ اس انقلاب کی کامیابی کے بعد اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابتداءً وہ قید میں رہا۔ اس کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ کو اسے اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ وہ انقلاب فرانس کے خلاف بیرونی طاقتوں سے سازباز کر رہا تھا تاکہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر سکے۔

فرانس کے اس آخری بادشاہ لوئی کے بارہ میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ روزانہ اپنی ڈائری تحریر کرے۔ اس ڈائری میں ہر روز وہ کسی تقرر، کسی واقعہ، کسی ملاقات کا مختصر اندراج کرتا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ کو اس نے بہت زیادہ وقت شکار میں گزارا تھا۔ رات کے وقت اس نے اس تاریخ کو اپنی ڈائری میں شکستہ انداز صرف ایک لفظ لکھ دیا —— کچھ نہیں:

It was the habit of King Louis XVI of France to keep a daily dairy. In it he would make a brief entry every day about an appointment, an event, or a meeting. On July 14, 1789, he had spent long hours hunting. At night he scribbled one short word against that date: **"Nothing"**.

فرانس کے بادشاہ کی ڈائری کا ۱۴ جولائی کا صفحہ ہر آدمی کی زندگی کا آخری صفحہ ہے۔ یہ صرف ایک ناکام بادشاہ کی کہانی نہیں، بلکہ یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔

ہر آدمی اپنے آپ کو کسی سرگرمی میں مصروف کیے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کچھ کر رہا ہوں۔ میں اپنے آخری دن کے لیے کچھ حاصل کر رہا ہوں۔ مگر جب دن ختم ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا آخری لمحہ آتا ہے تو وہ حیرانی کے ساتھ دیکھتا ہے کہ اس نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس کی زندگی کی کتاب کے آخری صفحہ پر کچھ نہیں (Nothing) لکھا ہوا ہے۔

کیسا عجیب ہے وہ عمل جو بے عملی ہو۔ کیسی عجیب ہیں وہ سرگرمیاں جو آخر میں صرف "کچھ نہیں" بن کر رہ جائیں۔

صبر، صبر، صبر

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حد درجہ خودپسند واقع ہوا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنے کو عزت اور بڑائی کے مقام پر دیکھے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی رائے سب سے اچھی رائے سمجھی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حق کے سفر کو موجودہ دنیا میں مشکل ترین سفر بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کروروں انسانوں میں ہر آدمی جب اپنے کو صحیح سمجھے تو کون کس کی بات سنے گا اور کون حق کو حق سمجھ کر قبول کرے گا۔

مگر یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو "میں پرستوں" کے ہجوم میں اپنے کو "یہ میں" بنا لے۔ جو اپنی خودپسندی کو خداپسندی میں تحلیل کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کرے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں وہ اپنی طرف سے منفی رویہ کا اظہار نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بے حد مشکل راستہ ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی آدمی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو کچل ڈالے۔

حق کا سفر جنت کا سفر ہے۔ اور جنت کے متعلق حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ ناخوش گواریوں سے ڈھانک دی گئی ہے (حجبت النار بالشہوات وحجبت الجنۃ بالمکارہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جنت کی طرف بڑھنے والے کے لئے ناخوش گوار حالات سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص بھی جنت کا مسافر بننا چاہے اس کو پہلے ہی جان لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس میں لوگوں کی طرف سے تلخ باتیں آئیں گی، جس میں طویل انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاری کی باتیں پیش آئیں گی۔ حتیٰ کہ کبھی جارحانہ کارروائیوں کا سامنا ہوگا۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کھو دے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ یا تو بددل ہو کر اپنا راستہ بدل لے گا یا درمیان کے کانٹوں سے الجھ کر رہ جائے گا اور آگے نہ بڑھ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام کا تمام صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لئے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپا لے۔

عین وقت پر

امتحان کسی طالب علم کی زندگی کا سب سے زیادہ نازک لمحہ ہوتا ہے۔ مگر یہی نازک لمحہ وہ لمحہ ہے جب کہ کسی طالب علم کی زندگی کا آخری فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو طالب علم امتحان کی نزاکتوں کو سوچ کر امتحان دینے سے رک جائے اس نے اپنے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے برباد کر لیا۔ وہ عین اسی وقت فیل ہو گیا جب کہ اس کو پاس ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ مومن و مسلم کا بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کسی شخص کے لیے جنت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کو آزمائش میں ڈالا جائے اور وہ آزمائش میں پورا اترے۔ آزمائش کے لمحات آنے پر اپنے آپ کو اس سے بچانا ایسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم کے لیے امتحان کا انتظام کیا جائے اور وہ اس کی سختیوں سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہو۔

ایک شخص معمول کے حالات میں حق کا ساتھ دے رہا تھا اور جب کوئی مشکل مرحلہ آیا تو وہ حق کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو گیا۔ ایک شخص مزاج کے موافق صورت حال میں اسلامی بنا ہوا تھا اور جب مزاج کے خلاف صورت حال سامنے آئی تو وہ اچانک غیر اسلامی بن گیا۔ ایک شخص معروف نقشہ میں دینداری دکھا رہا تھا مگر جب کوئی غیر معروف نقشہ سامنے آیا تو وہ دین دار بننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ایک شخص "ساحل" پر اسلام کی باتیں کر رہا تھا اور جب "دریا" کی موجوں سے سابقہ پیش آیا تو وہ اسلامی باتیں بھول کر بالکل مختلف انسان بن گیا۔

ایسی تمام مثالیں آزمائش میں پورا نہ ہونے کی مثالیں ہیں۔ ایسے تمام مواقع وہ مواقع تھے جب کہ اس کا خدا چاہتا تھا کہ اس کی جانچ کر کے اس کو جنت کے باغوں میں داخل کر دے۔ مگر عین وقت پر وہ جانچ میں پورا نہ اترا۔ اس کا رب اس کے پاس آیا مگر وہ پیٹھ پھیر کر اپنے رب سے دور چلا گیا۔

آہ وہ انسان، جس کے سامنے جنت کا دروازہ کھولا گیا۔ مگر عین وقت پر وہ جنت میں داخل ہونے سے باز رہا۔ وہ عین اس وقت ناکام ہو گیا جب کہ اس کو کامیاب ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔

اپنا نقصان

اس دنیا میں سب سے بڑی چیز کیا ہے جس کو آدمی پائے۔ اور جس کو پانے کا خصوصی طالب بنے۔ یہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی خدائی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ خدا کی رحمت کا فیضان ہر آن دنیا میں برستا ہے، مگر اس کو پانے والا وہی شخص ہے جس نے اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو۔

جب ایک شخص پر تنقید کی جائے اور وہ تنقید کو سن کر بگڑ اٹھے تو اس نے اپنے آپ کو فیضانِ الٰہی سے محروم کر لیا، کیوں کہ تنقید کو سن کر بگڑنا کبر ہے، اور جس سینہ میں کبر ہو وہ سینہ کبھی فیضانِ الٰہی کا مہبط نہیں بن سکتا۔

یہی معاملہ تمام دوسری چیزوں کا ہے۔ ایک شخص کے سامنے حق بات واضح دلائل کے ساتھ پیش کی جائے مگر وہ اس کو نہ مانے اور دھاندلی کا انداز اختیار کرے، ایسا شخص کبھی خدا کی قربت کا تجربہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ خدا اعتراف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، دھاندلی کرنے والے لوگ اُسے پسند نہیں۔

آسمان سے بارش ہو تو زرخیز زمین اس کو قبول کرتی ہے۔ پانی اس کے اندر داخل ہو کر اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس سے فصل اگے، اس میں پھول اور پھل پیدا ہوں۔ مگر یہی بارش پتھر کی چٹان پر پڑتی ہے تو وہ اوپر اوپر بہہ جاتی ہے۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہیں پہونچاتی۔

یہی مثال خدائی فیضان کے معاملہ میں انسان کی ہے۔ خدا کا فیضان ہر لمحہ دنیا میں برس رہا ہے۔ تاہم اس کو وہی شخص پاتا ہے جس نے اپنے اندر اس کو پانے کی استعداد پیدا کی ہو۔ جس شخص کے اندر استعداد نہ ہو، اس کے اوپر خدا کا فیضان برسے گا مگر وہ پتھر کی چٹان کی طرح اوپر ہی اوپر سے گزر جائے گا۔ وہ اس کے سینہ کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ وہ اس کی روح میں شامل ہو کر اس کو روشن نہیں کرے گا۔

اپنے سینہ کے پتھریلے پن کو ختم کیجئے، اس کو نرم مٹی کی طرح بنا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا سینہ ربانی فصل کا چمنستان بن گیا ہے۔

دعوت الی اللہ

اسلامی دعوت

قرآن کی ایک سورہ میں قرآنی دعوت کا خلاصہ ان لفظوں میں آیا ہے :

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ وابراھیم الذی وفّٰی۔ الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ وان لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ وان سعیہ سوف یُریٰ ثم یجزاہ الجزاء الاوفی۔ وان الی ربک المنتھیٰ (النجم ۳۶-۴۲)

کیا اس کو اس کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے جس نے پوری تعمیل کی۔ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کیا۔ اور یہ کہ انسان کی سعی جلد دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ تیرے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے۔

ان آیات میں جو انداز دعوت ملتا ہے اس کا نمونہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تقریروں میں بھی موجود ہے۔ مثلاً آپ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو آپ نے اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:

فمن استطاع ان یقی وجھہ من النار ولو بشق من تمرۃ فلیفعل ومن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ (سیرۃ ابن ھشام، جزء ثانی ۱۱۸)

جو شخص اپنے چہرہ کو آگ سے بچا سکے وہ بچائے، خواہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ ہو۔ اور جو شخص یہ بھی نہ پائے تو ایک پاک بول کے ذریعہ۔

صحابہ کرام کی تبلیغ کا انداز بھی یہی تھا۔ مثال کے طور پر عمرو بن میمون اَودی کہتے ہیں:

قام فینا معاذ بن جبل فقال: یا بنی اود، انی رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیکم۔ تعلمون ان المعاد الی اللہ الی الجنۃ او الی النار (مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث، صفحہ ۴۰۴)

معاذ بن جبلؓ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اے بنی اَود، میں تمہاری طرف خدا کے رسول کا بھیجا ہوا قاصد ہوں۔ جان لو کہ خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ لوٹنا یا جنت کی طرف ہوگا یا آگ کی طرف۔

اسلامی دعوت در اصل خدا اور آخرت کی یاد دہانی ہے۔ انسان کو خدا سے جوڑنا اور آخرت کی پکڑ کا زندہ احساس پیدا کرنا ہی وہ اصل کام ہے جس پر اسلامی دعوت مرتکز رہتی ہے۔

تبلیغی طاقت

قرآن میں ایک مضمون دو مقامات پر بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم دونوں آیتیں نقل کرتے ہیں :

اولم یروا انا ناتی الارض ننقصہا من اطرافہا واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب (الرعد ۴۱)	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی اس کے فیصلے کو پیچھے ڈالنے والا نہیں۔ اور وہ جلد حساب کرنے والا ہے۔
افلا یرون انا ناتی الارض ننقصہا من اطرافہا افہم الغالبون (الانبیاء ۴۴)	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کے اکابر اور سرداروں نے آپ کو رد کر دیا۔ انھوں نے آپ کے ساتھیوں کو بہکایا۔ آپ کے بارہ میں بے بنیاد پروپیگنڈے کیے۔ آپ کی معاشیات کو تباہ کیا۔ آپ کو اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کیا۔ آپ پر جارحانہ حملے کیے۔ آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔

قریش خوش تھے کہ انھوں نے یہ سب کر کے پیغمبر اسلام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انھوں نے آپ کے "مسئلہ" کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ عین اس وقت یہ کہا گیا کہ تمہارا یہ بے بنیاد خیال صرف اس لیے ہے کہ تمہاری آنکھیں صرف قریب کے حالات کو دیکھ رہی ہیں، دور کے احوال کی تمہیں خبر نہیں۔

عین اس وقت جب کہ قریش اسلام کا جغرافی دائرہ تنگ کر رہے تھے، اس کا نظریاتی دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر روز شرک کے حلقہ سے کچھ افراد نکل کر اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ قریش اسلام کے مادی جغرافیہ کو تنگ کر کے خوش ہو رہے تھے مگر اسلام کی تبلیغی طاقت خود قریش کے نظریاتی جغرافیہ کو تنگ کر رہی تھی۔ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ پہلی طاقت کے مقابلہ میں دوسری طاقت زیادہ موثر ہے۔

دعوت و تبلیغ سب سے بڑی طاقت ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

دعوت کے آداب

حمیر قدیم عرب کا ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ اس نے موجودہ یمن کے علاقہ میں کئی سو سال تک حکومت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد جب اطراف عرب کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط بھیجے تو حمیر کے شاہی خاندان کے افراد (حارث، مسروح، نعیم بن کلال) کے نام بھی دعوتی مکتوب روانہ فرمایا۔ اس واقعہ کی تفصیلات طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

مذکورہ دعوتی مکتوب کو لے کر جو صحابی یمن گئے تھے ان کا نام عیاش بن ربیعہؓ ہے۔ حضرت عیاش کو اپنا مکتوب حوالہ کرنے کے ساتھ آپ نے کئی خصوصی ہدایات بھی انھیں دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ راستہ میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے ہوئے جائیں اور جب منزل پر پہونچیں تو پہلے دو رکعت نماز ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں کے یہاں جا کر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی مکتوب پیش کریں۔ (طبقات ابن سعد، جلد اوّل)

حضرت عیاشؓ نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے راستہ میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنے کا اہتمام کیا۔ اور پھر دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے اور مدعو کے حق میں دعائیں کیں۔ اس کے بعد وہ ان کی قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تینوں اشخاص غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔

اس واقعہ سے داعی کا اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک شخص کسی بھٹکے ہوئے آدمی کے سامنے حق کی دعوت پیش کرے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کی انا جاگ اُٹھے اور وہ بُرے طریقہ سے اس کا جواب دے۔ ایسے موقع پر داعی کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر اشتعال سے بچے۔ اور اگر بالفرض اس کے اندر جوابی اشتعال پیدا ہو تو اس کو شیطانی فعل سمجھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے۔ داعی کے دل میں مدعو کی اس حد تک خیر خواہی ہونی چاہیے کہ وہ اس کی ہدایت کی دعا کرنے لگے۔ وہ آخری حد تک اس کی ہدایت اور اصلاح کا حریص بن جائے۔

دعوت کے حدود

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ ۲۲) اسی طرح دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ تم لوگوں کے اوپر جبر کرنے والے نہیں ہو، پس تم قرآن کے ذریعہ اس شخص کو نصیحت کرو جو میرے ڈرانے سے ڈرے (ق ۴۵) حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

عن ابی موسیٰ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث احداً من اصحابہ فی بعض امرہ قال "بشروا ولا تنفروا، ویسّروا ولا تعسّروا" (متفق علیہ)

حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو کسی کام پر بھیجتے تو فرماتے کہ خوش خبری دو اور متنفر نہ کرو، آسانی پیدا کرو اور لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو۔

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں گویا دعوت کے عمل کی حد بندی کر رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو ابلاغ کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا ہے، اس کو اجبار کے دائرہ میں داخل نہیں ہونا ہے۔ اس کو یہ حق ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے کے تمام ذرائع کو استعمال کرے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ تخریبی طریقہ اختیار کر کے لوگوں کو مجبور کرنے لگے۔ مثال کے طور پر فیملی پلاننگ کو لیجئے۔ فیملی پلاننگ کا موجودہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک داعی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کو ثابت کرے۔ اور اس طرح اس کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اس طریقہ کی ایک مثال راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳ - ۲۶) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کچھ لوگ "اینٹی فیملی پلاننگ مہم" چلائیں۔ وہ فیملی پلاننگ کے پوسٹر پھاڑیں، اخباروں کو جلائیں اور دکانوں کو بند کرائیں، تو اس قسم کی مہم درست نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ دعوت نہیں ایجی ٹیشن ہے۔ یہ ابلاغ کی حد کو پار کر کے اجبار کی حد میں داخل ہونا ہے، اور اس قسم کا تجاوز داعی کے لیے جائز نہیں۔ ایسا طریق کار لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا سبب بنتا ہے، جب کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔ اس قسم کی "اینٹی" مہم چلانا گویا دعوتی مواقع کو قتل کرنا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تخریب کاری ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

مزاج دعوت

فرعون قدیم مصر کا نہایت سرکش اور متکبر بادشاہ تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبر بنا کر فرعون کے پاس بھیجا۔ اس وقت اللہ نے حضرت موسیٰ اور آپ کے شریک نبوت حضرت ہارون کو جو ہدایت کی وہ یہ تھی:

اذھبا الیٰ فرعون انہ طغیٰ۔ فقولا لہ قولاً لینا لعلہ یتذکر او یخشیٰ (طٰہٰ ۴۴)	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔ پھر اس سے تم لوگ نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

یہ فرعون سرکشی کی آخری حد پر پہنچ گیا تھا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ اصلاح قبول کرنے والا نہیں ہے۔ پھر بھی پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ اس کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی اور شفقت کے ساتھ بات کرنا۔ اس کی گمراہی اور سرکشی کی بنا پر سختی کا انداز مت اختیار کرنا۔ اس آیت کی تشریح میں مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے:

ھذہ الایۃ فیھا عبرۃ عظیمۃ وھو ان فرعون فی غایۃ العتو والاستکبار وموسیٰ صفوۃ اللہ من خلقہ۔ اذذاک ومع ھذا امران لا یخاطب فرعون الا بالملاطفۃ واللین	اس آیت میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ یہ کہ فرعون حد درجہ سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا تھا اور موسیٰ انسانوں میں سے اللہ کے چنے ہوئے تھے۔ پھر بھی اور اس کے باوجود حکم ہوا کہ فرعون کو مخاطب کریں تو صرف نرمی اور ملاطفت کے ساتھ مخاطب کریں۔

اس واقعہ سے دعوت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کلام کو لازمی طور پر نرم کلام ہونا چاہئے۔ مدعو کا ظلم اور سرکشی اپنی آخری حد پر پہنچ جائے، حتیٰ کہ یہ بھی واضح ہو کہ وہ ہدایت قبول کرنے والا نہیں، تب بھی داعی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے نرم انداز کو چھوڑ دے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر نرمی اور شفقت پر قائم رہنا ہے۔ خواہ مدعو جو انداز بھی اختیار کرے۔

داعی بننا صبر کی زمین پر کھڑا ہونا ہے۔ جو لوگ صبر کی زمین پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے انھیں دعوت کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔

داعی کا اخلاق

ایک دکاندار ہے۔ اس کے یہاں ایک گاہک آتا ہے۔ اس گاہک کو ۵۰ ہزار روپیہ کا مال خریدنا ہے۔ بات چیت کے دوران گاہک کی زبان سے کوئی کڑوا بول نکل جاتا ہے۔ اس پر دکاندار کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ بھی جواب میں کڑوی بات بول دیتا ہے۔ گاہک بگڑ جاتا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے، اور دوسری دکان سے خریداری کا معاملہ کرتا ہے۔

اب یہ دکاندار اگر واقعی دکاندار ہے تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے گا۔ وہ سوچے گا کہ میں کیوں غصہ ہوگیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اس کی بات کو برداشت کرلیتا۔ اس کے کڑوے بول کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے میٹھا بول بولتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو ایک قیمتی گاہک میرے ہاتھ سے نہ نکلتا۔ خواہ مخواہ میں نے آئے ہوئے گاہک کو کھو دیا۔

اس کے برعکس اگر دکاندار کے اندر "دادا" والا مزاج ہے تو وہ اپنے آپ کو بھول کر صرف گاہک کو برا بتائے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ شخص خریداری کرنے آیا تھا یا میرے اوپر ڈکٹیٹری کرنے آیا تھا۔ میں کیوں کسی سے دبوں، کیا میں کسی کا غلام ہوں۔ مجھے ایسے گاہکوں کی کوئی پروا نہیں۔ ان کو آنا ہے تو آئیں اور نہیں آنا ہے تو نہ آئیں ——— اس مثال میں پہلا دکاندار سچا دکاندار ہے، اور دوسرا دکاندار جھوٹا دکاندار۔

دعوت کے عمل کو قرآن میں تجارت (الصّف ۱۰) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ تاجر ہمیشہ ذمہ داری کو خود قبول کرتا ہے، اس کے بغیر وہ دوسروں کو اپنا گاہک نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح خدا کا داعی ایسا کرتا ہے کہ وہ فریق ثانی کی زیادتیوں کو نظر انداز کرکے یک طرفہ طور پر اس کے ساتھ حُسن اخلاق کا معاملہ کرتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ دوسروں کو اپنا مدعو نہیں بنا سکتا۔

ایک تاجر اپنی دنیا کے فائدہ کے لیے جو کچھ کرتا ہے، وہی ایک داعی اپنی آخرت کے فائدہ کے لیے کرتا ہے۔ اس اعلیٰ کردار کے بغیر نہ کوئی تاجر تاجر بن سکتا، اور نہ کوئی داعی داعی۔

تاجرانہ کردار کے بغیر تجارت نہیں، اسی طرح داعیانہ کردار کے بغیر دعوت نہیں۔

تبلیغ کے طریقے

۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل شرک کے درمیان حالت جنگ قائم تھی۔ عین اس وقت قرآن میں حکم دیا گیا کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے (حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ) التوبہ ۶

دوسری جگہ قرآن میں تبلیغ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ تم ان کو قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو (فَذَکِّرْھُمْ بِالْقُرْاٰنِ) ق ۴۵

پہلی آیت میں "سننے" کی بات کہی گئی ہے اور دوسری آیت میں "سنانے" کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو سننے کا موقع دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ داعی خود مخاطب کے پاس پہنچ کر اس کو سنائے۔ ایک کو بالواسطہ تبلیغ کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو براہ راست تبلیغ۔

اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت تبلیغ کی ہے۔ حتی کہ عین جنگ کے دوران دشمن قوم کا ایک فرد مسلم آبادی میں آجائے تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ وہ آزادانہ طور پر اسلام کو سمجھ سکے۔ مسلم معاشرہ میں کلام خداوندی یا تعلیمات اسلامی کا چرچا اس طرح جاری رہنا چاہیے کہ جب بھی کوئی شخص وہاں آئے تو وہ خدائی بات کو سُن سکے اور اسلام کی تعلیمات سے واقف ہو سکے۔ وہی معاشرہ مسلم معاشرہ ہے جو اپنے ماحول کے اعتبار سے اسلام کی عملی تبلیغ بنا ہوا ہو۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو اسلام کی براہ راست تبلیغ میں سرگرم رہنا چاہیے۔ ان پر فرض ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام کی زبان سیکھیں۔ ان کی تہذیب کا مطالعہ کریں۔ وہ فکری اور علمی اعتبار سے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں کہ وہ غیر مسلم اقوام پر اسلام کی موثر تبلیغ کر سکیں۔

کسی مسلم معاشرہ کو جانچنے کا یہی صحیح ترین معیار ہے۔ جس معاشرہ میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں وہ مسلم معاشرہ ہے، اور جہاں یہ دونوں باتیں موجود نہ ہوں، وہ ایک عام قسم کا دنیوی معاشرہ ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں وہ معاشرہ جس کو مسلم معاشرہ کہا جائے۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، اس لیے اسلام کی تمام سرگرمیاں تبلیغ رخی (Tabligh-oriented) ہیں، حتی کہ ہنگامی دور کی سرگرمیاں بھی۔

ایک تاریخ

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر جب ان کا خاندان مصر گیا تو افراد خاندان کی کل تعداد ۶۷ تھی۔ (اس تعداد میں وہ لڑکیاں شمار نہیں کی گئی تھیں جو حضرت یعقوب کے گھرانے میں بیاہی ہوئی آئی تھیں) حضرت یوسف کی وفات کے تقریباً پانچ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق خروج کے بعد دوسرے سال بیابان سینا میں حضرت موسیٰ نے جو مردم شماری کرائی تھی، اس کے مطابق صرف قابل جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب ملا کر وہ کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ۶۷ افراد کے ایک خاندان کی تعداد پانچ سو سال میں محض توالد و تناسل سے اتنی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ تعداد میں اس غیر معمولی اضافہ کا سبب یقیناً بنی اسرائیل کی تبلیغ تھی۔ ان کی تبلیغ کے زیر اثر جن مصریوں نے اپنا دین بدلا، غالباً ان کا تمدن بھی بنی اسرائیل کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ بائبل میں ان نومسلموں کے لیے "ملی جلی بھیڑ" جیسے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کے یہ دینی بھائی بھی ان کے ساتھ تھے۔

بنی اسرائیل کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مصر میں مکمل طور پر مغلوب اور محکوم حالت میں تھے۔ مصری ان کو غلام اور مزدور کے درجہ میں رکھ کر ان سے خدمت لیتے تھے۔ قبطی قوم کی حیثیت معزز قوم کی تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کی حیثیت حقیر اور ناقابل ذکر قوم کی۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل کے دین نے بہت سے قبطیوں کو متاثر کیا۔ وہ فرعون کا مذہب چھوڑ کر موسیٰ کے مذہب میں داخل ہو گیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین حق تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت ہے۔ دین حق وہاں بھی لوگوں کو مسخر کر لیتا ہے جہاں بظاہر اس کا امکان دکھائی نہ دیتا ہو کہ وہ لوگوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

خدا کے دین کی طلب خود انسانی فطرت کے اندر موجود ہے اور یہی اس کی اصل طاقت ہے۔ خدا کا دین خود اپنی طاقت کے زور پر لوگوں کے سینہ میں داخل ہوتا ہے نہ کہ اہل دین کی قومی یا مادی طاقت کے زور پر۔

یہ انسان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : " زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر وہ دھیان نہیں دیتے " (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہو رہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لیے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔ جو لوگ خدا کی تحریر کو نہ پڑھ سکیں وہ انسان کی تحریر کو پڑھ کر کیا پائیں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسان انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لیے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسراء۔ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہے کہ تم دوسروں کے لیے سیرابی اور تراوٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسروں کے لیے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ۔ ۷۴)

زمین کے سینے پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اعلان کر سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے۔ اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم۔ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن خدائی سچائیوں کا اعلان کر رہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لیے لوگوں کے کان بہرے ہو جائیں۔ اور خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لیے قیامت کی چنگھاڑ ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔

فتحِ مبین

امن کی طاقت

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں عرب میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ اس زمانہ میں انسان صرف تشدد کی زبان جانتا تھا۔ یہ مزاج ہزاروں سال سے دنیا میں چلا آرہا تھا۔ عرب میں یہ مثل مشہور تھی کہ قتل کا بہترین جواب قتل ہے (القتل انفی للقتل) اور لڑائی کا بہترین حل لڑائی کرنا ہے (الحرب انفی للحرب)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے بالکل برعکس پیغام دیا۔ آپ نے انسان کو بتایا کہ جنگ سب سے بڑی طاقت نہیں، بلکہ امن سب سے بڑی طاقت ہے۔ آپ نے امن کی قوتوں سے انسان کو آگاہ کیا اور خود اس پر عمل کر کے دکھایا کہ امن کس طرح تمام مسائل کا بہترین حل ہے۔

امن کی طاقت کیا ہے۔ آپ نے بتایا کہ امن کی طاقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت کو جگایا جائے۔ فطرت حق پسند ہے اور یہ فطرت ہر انسان کے اندر ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ فطرت کے راستہ سے انسان کو حق کے اعتراف کی طرف لایا جاسکے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو قرآن لے کر آئے اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر دو خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک، وہ جس کو قرآن میں نفس امارہ کہا گیا ہے۔ دوسرا، وہ جس کے لیے قرآن میں نفس لوّامہ کے الفاظ آئے ہیں۔ نفس امارہ کو آج کل کی زبان میں انانیت کہا جاسکتا ہے۔ اور نفس لوّامہ کو ضمیر۔

یہ دونوں صلاحیتیں ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ آدمی اس پر قادر نہیں کہ وہ ان میں سے کسی صلاحیت کو اپنے اندر سے مٹا دے۔ جو لوگ جنگ و قتل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ آدمی کے نفس امارہ کو جگاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ امن کی طاقت کو استعمال کرتے ہیں وہ آدمی کے نفس لوامہ کو بیدار کرتے ہیں۔

جنگ کا طریقہ انسان کو ختم کر کے اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے۔ اور امن کا طریقہ یہ چاہتا ہے کہ انسان کو دوست بنا کر یا اس کی اصلاح کر کے اپنا مسئلہ حل کرے۔ جنگ کا طریقہ صرف مسائل میں اضافہ کرتا ہے، جب کہ امن کا طریقہ مسئلہ کو حل بھی کرتا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی سماج کو بے شمار نئے فائدوں سے معمور کر دیتا ہے۔

اعراض کا اصول

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی خود مالکِ کائنات کی طرف سے دی گئی ہے، اس لیے قیامت سے پہلے اس کا ختم ہونا ممکن نہیں۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان پیغمبر کے اوپر پتھر مارتا ہے۔ وہ حق پرستوں کو ستاتا ہے اور دعوتِ حق کے مقابلہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔

داعی اگر ایسا کرے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں پر اس سے لڑجائے تو دعوت کا کام کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد دنیا میں جنگ وجدال کی تاریخیں تو بنیں گی۔ مگر اشاعتِ دین اور صالح سماجی نظام کی تاریخیں کبھی ظہور میں نہ آئیں گی۔

قرآن وحدیث میں اس مسئلہ کا حل صبر و اعراض بتایا گیا ہے۔ یعنی مدعو کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا، اور ان کو نظر انداز کرتے ہوئے مثبت انداز میں اپنا دعوتی عمل جاری رکھنا۔ تمام پیغمبروں نے ایسا ہی کیا ہے، اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طریقہ پر کاربند رہتے ہوئے اپنے دعوتی مشن کو تکمیل تک پہونچایا ہے۔

صبر و اعراض کوئی انفعالی طریقہ نہیں، وہ ایک ایجابی اصول ہے۔ داعی اپنے مدعو کے حق میں آخری حد تک خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں پر نہ صرف اعراض کرتا ہے بلکہ زیادتی کے باوجود اس کے دل سے مدعو کے حق میں دعائیں نکلتی ہیں۔

صبر و اعراض کے اسی عمومی اصول کی ایک عملی صورت وہ تھی جس کو اسلام کی تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اس اصول کو اس کی آخری اور انتہائی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ شاندار کامیابی کی صورت میں نکلا جس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

"حدیبیہ اصول" کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی سے بے فائدہ نزاع کو اوائڈ کر کے اپنے لیے کام کا موقع پیدا کرنا۔ اپنی طاقتوں کو تخریب غیر میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیر خویش میں لگانا۔ حال کے بجائے مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنا منصوبہ بنانا۔

مستقل اصول

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں توحید کا عقیدہ داخل کرے، لوگوں کو ایک اللہ کا پرستار اور اطاعت گزار بنائے۔ یہ کام صرف نرمی کے ذریعہ انجام پاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا قائم ہو۔ تاکہ مدعو کھلے دل کے ساتھ داعی کی بات کو سنے اور اس کو اپنے دل میں جگہ دے۔

دنیا میں مختلف اسباب سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان نزاع پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح داعی اور مدعو کے درمیان بھی نزاع کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نزاع دعوتی عمل کے لیے قاتل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نزاع کی اس فضا کو کس طرح ختم کیا جائے۔

ایسے مواقع پر ہمیشہ وہ آدمی پہل کرتا ہے جو نزاع کو اپنے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ سمجھتا ہو۔ اب چونکہ داعی کے دل میں مدعو کا درد ہوتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ اس بات کے لیے فکرمند ہوتا ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان نزاع ختم ہوجائے۔

داعی کا یہ درد اور اس کا یہ خیر خواہانہ جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خود نزاع کو ختم کرنے کی ذمہ داری لے۔ وہ یک طرفہ طور پر قربانی دے کر نزاع کی فضا کو ختم کر دے۔ اسی یک طرفہ قربانی کو اعراض کہا جاتا ہے۔ اور اسی اعراض کی ایک تاریخی مثال صلح حدیبیہ ہے۔

صلح حدیبیہ کوئی منفرد واقعہ نہیں۔ وہ اسلام کے دعوتی اصول کا ایک لازمی اور عمومی جزء ہے۔ دعوت کے عمل میں ہر روز داعی کو "حدیبیہ اسپرٹ" کے تحت کام کرنا ہے۔ چنانچہ وہ بار بار یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں کو نظرانداز کرتا ہے تاکہ دعوت کا عمل اپنے مطلوبہ انداز میں جاری رہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی پیغمبرانہ زندگی کی پوری مدت میں "حدیبیہ اسپرٹ" کے تحت عمل فرماتے رہے۔ البتہ ہجرت کے بعد حدیبیہ کے مقام پر اس نوعیت کا ایک ممتاز واقعہ پیش آیا جس نے اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ "حدیبیہ اسپرٹ" داعی کی زندگی میں ہر روز شامل رہتی ہے۔ البتہ حالات کے مطابق کبھی وہ کسی مخصوص تاریخی واقعہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے جیسا کہ حدیبیہ میں ہوا۔

تاریخ ساز عمل

ہجرت کے بعد مخالفین کی جارحیت کی بنا پر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک کے بعد ایک جنگیں ہو رہی تھیں مگر فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں مخالفین سے یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ اسی صلح سے فتح کا دروازہ کھلا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: فتح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح اسلام میں نہیں ہوئی (ماکان فتح اعظم فی الاسلام من فتح الحدیبیۃ)

مگر صلح حدیبیہ پر راضی ہونا انتہائی مشکل معاملہ تھا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی صلح تھی جو دشمنوں کی اپنی شرائط پر کی گئی تھی۔ چنانچہ ایک حضرت ابوبکر کو چھوڑ کر تمام کے تمام صحابہ اس کے مخالف ہوگئے حضرت عمر فاروقؓ نے بعد کے زمانہ میں ایک شخص سے کہا:

لقد صالح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل مکۃ علی صلح واعطاھم شیئا لو ان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَّرَ علیَّ امیراً فصنع الذی صنع نبی اللہ ما سمعتُ ولا اطعتُ۔ وکان الذی جعل لھم انّ من لحق من الکفار بالمسلمین ردّوہ ومن لحق بالکفار لم یردّوہ

(کنز العمال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں سے صلح کی اور ان کو کچھ چیزیں دیدیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اوپر کسی کو امیر بنایا ہوتا اور وہ امیر وہ کرتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تو میں نہ سنتا اور نہ مانتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے جو کچھ مقرر کیا اس میں سے یہ تھا کہ کافروں میں سے جو شخص مسلمانوں سے مل جائے تو مسلمان اس کو لوٹا دیں گے اور مسلمانوں میں سے جو شخص کافروں کو ملے تو کافر اس کو نہیں لوٹائیں گے۔

دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ مگر اس سب سے بڑی کامیابی تک پہونچنے کا راز اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا تھا کہ —— اپنی جو چیز دشمنوں کے قبضہ میں چلی جائے اس کو واپس لینے پر اصرار نہ کریں۔ اور دشمنوں کی جو چیز اپنے قبضہ میں ہو اس کو دوبارہ واپس کرنے پر راضی ہو جائیں۔

وسیع تر میدان

صلح حدیبیہ ذوالقعدہ ۶ھ میں ہوئی۔ واقدی کے بیان کے مطابق، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے فوراً بعد ذوالحجہ ۶ھ میں اطراف مدینہ اور اطراف عرب میں دعوتی وفود بھیجنے شروع کر دیئے۔ ابن کثیر نے اس سلسلہ میں حسب ذیل روایت نقل کی ہے:

(صلح حدیبیہ کے بعد) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن منبر پر خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ کی حمد کی اور اس کی تعریف کی اور شہادت دی۔ پھر فرمایا کہ اے لوگو، میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو عجمی بادشاہوں کے پاس بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے اوپر اختلاف نہ کرو جس طرح بنی اسرائیل نے عیسی بن مریم سے اختلاف کیا۔ مہاجرین نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ہم آپ سے کسی بھی چیز میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ پس آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے (البدایہ والنہایہ ۴/۲۶۸)

صلح حدیبیہ کے بعد آپ کو ایک وقفۂ امن حاصل ہو گیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقفۂ امن کو اسلام کی عالمی اشاعت کے لیے استعمال فرمایا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ نے حاکموں اور بادشاہوں کی طرف مسلمانوں کے وفود بھیجے جو آپ کے خطوط لے کر ان کے پاس گیے، اور انھیں توحید کی دعوت پہونچائی۔ ان حاکموں اور بادشاہوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی۔ جن افراد کے نام آپ نے یہ دعوتی خطوط بھیجے ان کے کچھ نام یہ ہیں: کسریٰ (ایران) ہوذہ بن علی (یمامہ) منذر بن ساوی (ھجر) جیفر و عباد (عمان) قیصر روم (شام) منذر بن الحارث (غسان) النجاشی (حبشہ) الحارث بن عبد کلال (یمن) ذوالکلاع الحمیری (اطراف یمن) المقوقس (مصر)

جنگ کے میدان میں اسلام قبائلی سرداروں کے مقابلہ میں بھی فیصلہ کن نہیں بن رہا تھا۔ مگر دعوت کے میدان میں آتے ہی اسلام کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ اس نے شاہان عالم کے مقابلہ میں نظریاتی اقدام کے مواقع حاصل کر لیے۔

اسلام کو اس تسخیری مقام پر لانے کی دو لازمی شرطیں ہیں —— یک طرفہ قربانی کے ذریعہ فریق ثانی کے ساتھ تمام جھگڑوں کو ختم کرنا تاکہ دعوت کی فضا ہموار ہو۔ اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد تاکہ وہ طاقت حاصل ہو جو دعوت کے عمل کو موثر طور پر جاری کرنے کے لیے ضروری ہے۔

مومنین کے لیے ہدایت

حدیبیہ کے معاہدہ کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ اللہ تم کو صراطِ مستقیم دکھائے اور تم کو نصرِ عزیز عطا کرے (الفتح ۳) یہاں یہ بات واحد کے صیغہ میں ہے۔ یہی بات آگے جمع کے صیغہ میں کہی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ــــــ اور تاکہ ایمان لانے والوں کے لیے نشانی ہو اور تاکہ اللہ تم لوگوں کو صراطِ مستقیم دکھائے (ولتکون آیۃ للمومنین ویھدیکم صراطاً مستقیماً) الفتح ۲۰

قرآن میں جو بات بطور اصول بتائی گئی تھی، وہی عملاً بھی پیش آئی۔ چنانچہ حدیبیہ معاہدہ کے بہت جلد بعد مکہ فتح ہوا، اور پورے عرب کی فتح کا راستہ کھل گیا۔ اس سلسلہ میں صحابہ و تابعین کے مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ مثلاً ابن شہاب الزہری تابعی (م ۱۲۴ھ) کہتے ہیں کہ اسلام میں جو سب سے بڑی فتح حاصل ہوئی وہ صلح حدیبیہ کی فتح تھی۔ (فما فتح فی الاسلام فتح قبلہ کان اعظم منہ) البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۷۰

قرآن کے مذکورہ الفاظ کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لیے جو فتح مقدر کی تھی، اس کی تدبیر آپ کو "حدیبیہ اصول" کی صورت میں بتائی گئی (الفتح ۱) اور پھر تمام مسلمانوں کے لیے اس واقعہ کو ایک نشانِ راہ کی حیثیت دیدی گئی (الفتح ۲۰) تاکہ آئندہ جب بھی وہ مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اسی تدبیر کو اختیار کرکے دوبارہ فتح و غلبہ تک پہونچ سکیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان دوبارہ مغلوبیت سے دوچار ہوئے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے نام سے تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غالب اقوام کے ساتھ مقابلہ آرائی کے معرکے برپا ہوئے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جس نے مسلمانوں کو یاد دلایا ہو کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق، تم دوبارہ اس تدبیر کو اختیار کرو جس کی رہنمائی اصولی اور عملی دونوں اعتبار سے زمانۂ رسول میں کی گئی تھی۔ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ دوبارہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم قرآن کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کے مطابق، حدیبیہ اصول پر عمل کریں تاکہ اللہ کی مدد سے ہم کو فتح مبین حاصل ہو سکے۔

ایسی حالت میں وہی نتیجہ نکلا جو قانون قدرت کے مطابق ایسے عمل کے لیے مقدر تھا۔ یعنی ساری کوششوں کے باوجود اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

قیادت کا راز

قرآن (السجدہ) میں بتایا گیا ہے کہ قیادت کا راز صبر ہے۔ بنی اسرائیل کے تذکرہ کے تحت ارشاد ہوا ہے کہ ان میں ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم کے تحت لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انھوں نے صبر کیا، (وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا) اس آیت کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان کے صبر کی وجہ سے ہم نے ان کو امام بنایا (ای بِصَبْرِهِمْ جَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً) القرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۱۴/۱۰۹

"حدیبیہ اصول" اسی صبر کی ایک منظم اور منصوبہ بند صورت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ردعمل کی نفسیات سے بچے اور مثبت ذہن کے ساتھ اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ اس قسم کا نقشۂ عمل بنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی صبر کی روش اختیار کرے۔ یعنی وہ فریق ثانی کی ایذاؤں کو برداشت کرے۔ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ وہ ہر دوسری بات کو نظر انداز کر کے اصل مقصد پر اپنی نظریں جمائے رہے۔

اس قسم کا صبر ہی کسی گروہ کو قوموں کے اوپر امام بناتا ہے۔ اور "حدیبیہ" اسی صابرانہ پالیسی کا ایک تاریخی عنوان ہے۔ جب قرآن کی صراحت ہے کہ قوموں کے امام وہ لوگ بنتے ہیں جو صبر (بالفاظ دیگر حدیبیہ اصول) کی صلاحیت کا ثبوت دیں۔ ایسی حالت میں وہ لوگ کیوں کر امامت اقوام کے منصب پر پہونچ سکتے ہیں جن کا حال یہ ہو کہ اس اصول پر عمل کرنا تو درکنار، وہ اس کے تصور تک سے آگاہ نہیں۔

کسان کے لیے زمین میں بیج ڈالنے یا بیج کے بغیر زراعت کرنے کے درمیان انتخاب نہیں ہے۔ بلکہ اس کو بیج ڈالنے اور فصل سے محرومی کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔ یہی صبر کی پالیسی کا معاملہ ہے۔ ہمارے لیے انتخاب کا موقع صابرانہ طریقہ اور غیر صابرانہ طریقہ میں نہیں ہے، بلکہ ہمیں اس میں انتخاب کرنا ہے کہ یا تو صبر کا طریقہ اختیار کر کے کامیابی تک پہونچیں۔ یا بے صبری کا طریقہ اختیار کر کے مکمل طور پر برباد ہو جائیں۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق خدا صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے (إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ) اور حدیث میں آگاہ کیا گیا ہے کہ مدد ہمیشہ صبر کے ساتھ آتی ہے (اعْلَمْ أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ) پھر جو چیز صبر کے ساتھ مقدر کر دی گئی ہو وہ بے صبری کے ساتھ کس طرح کسی کو مل سکتی ہے۔

روحانی مطلوب

اللہ نے تمام انسانوں کو اپنے دین پر پیدا کیا ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے پیدائشی طور پر "مسلم" ہے۔ اسلامی دعوت صرف یہ کرتی ہے کہ آدمی کو اس کی فطرت میں چھپا ہوا سبق یاد دلاتی ہے، وہ آدمی کے لاشعور کو شعور کی سطح پر لے آتی ہے۔

ہر پیغمبر کا دین اصلاً یہی دین فطرت تھا۔ مگر تحریف اور تبدیلی کے نتیجہ میں پچھلے دینوں نے فطرت انسانی سے اپنی مطابقت کھودی ہے۔ اس لیے اب یہ حیثیت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام پورے معنوں میں دین فطرت بھی ہے اور اسی کے ساتھ پوری طرح تحریف اور ملاوٹ سے پاک بھی۔

اسلام کی اس خصوصیت نے اسلام کو بلاشرکت دینِ انسانی کی حیثیت دیدی ہے۔ امکانی طور پر آج ہر انسان اسی دین خداوندی کا منتظر ہے جس کو اسلام کہا جاتا ہے۔ انسان کی فطرت ایک دین کی طالب ہے، اور یہ دین اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔

اسلام تمام انسانوں کا اپنا روحانی مطلوب ہے۔ اور جو پیغام خود مخاطب کے اپنے دل کی طلب بنا ہوا ہو، اس کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے۔ اس کی تسخیری صلاحیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اسلام اپنی اسی طاقت کے زور پر ہر دور میں پھیلتا رہا ہے۔ آج بھی وہ اپنی اسی طاقت کے زور پر پھیل رہا ہے۔ اسلام کی اشاعت کے اس عمل میں واحد رکاوٹ صرف وہ نزاعات ہیں جو مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان قائم ہوگئے ہیں۔ مسلمان اگر یک طرفہ اقدام کے ذریعہ ان نزاعات کو ختم کر دیں تو اسلام آج کی دنیا میں اس طرح پھیلے گا جس طرح سیلاب کا پانی زمین پر پھیلتا ہے۔

اسلام اپنی ذات میں طاقت ہے۔ انسان خود اپنے دل کی آواز کے تحت اس کی طرف کھنچتا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اسلام کو اس کی اصل صورت میں انسان تک پہونچا دیا جائے۔ اسلام ہر آدمی کا فطری تقاضا ہے۔ اسلام ہر آدمی کا روحانی مطلوب ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی فطرت کی پکار کو نہ سنے، کون ہے جو خود اپنی روحانی آواز پر کان نہ لگائے۔

زندگی کی تعمیر

اگر آپ جنوری ۱۹۹۰ میں ہوں تو دسمبر ۱۹۹۰ کی منزل تک پہونچنے کے لیے آپ کو بارہ مہینہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۵ بار گھومے گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ آپ کا ایک سال پورا ہو اور آپ تکمیلِ سال کے مرحلہ تک پہونچ سکیں ـــــــ کتنی زیادہ معلوم ہے یہ حقیقت۔ مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس معلوم بات کو جانتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان بار بار اقدام کرتے ہیں اور بار بار ناکام ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام کے مذکورہ تقاضے پورے نہیں کرتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو بات جاننی ہے وہ یہی ہے۔ انھیں اپنے بارہ میں اس حقیقت کو جاننا ہے کہ وہ تاریخ کے آغاز میں ہیں، وہ تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ جو شخص راستہ کے ابتدائی سرے پر کھڑا ہوا ہو، وہ درمیانی فاصلہ کو طے کیے بغیر راستہ کے انتہائی سرے پر نہیں پہونچ سکتا۔

یہ اس دنیا کا ایک عالم گیر قانون ہے۔ مگر اس عالم گیر قانون کو مسلمانوں کے رہنما ملت کی تعمیر کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ عملاً پہلے مہینہ میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں۔ وہ بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے ہوئے نظر آئیں۔ واقعہ کے اعتبار سے وہ اپنے سفر کے آغاز میں ہوتے ہیں اور ایسے انتہائی الفاظ بولتے ہیں گویا کہ وہ درمیانی راستہ طے کیے بغیر اپنی آخری منزل پر پہونچ گیے ہیں۔

یاد رکھیے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں۔ ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینا ہے جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔ ان کے اندر وہ شعور بیدار کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔ ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔

یہ سارے کام جب قابلِ لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے، اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لیے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے، نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔

قدرت کا پیغام

جون ۱۹۸۹ء میں ایک ہفتہ کے لیے میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے ۔ میں کچھ کشمیری بھائیوں کے ساتھ سرینگر کے باہر ایک ایسے مقام پر گیا جو بالکل کھلا ہوا تھا۔ سرسبز وادی اور برف پوش پہاڑوں کے درمیان ہمارے چاروں طرف پانی کے صاف شفاف چشمے بہتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے بہنے کی آواز قدرت کی دھیمی سرگوشی کی مانند ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی ۔

میں ایک چشمہ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ یہ تقریباً ۲ فٹ کی چوڑائی میں بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عین چشمہ کے بیچ میں ایک بڑا سا گول پتھر ابھرا ہوا ہے ۔ صاف ستھرا پانی بہتا ہوا جب اِس پتھر تک پہنچتا ہے تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ وہ پتھر کو توڑ کر اپنے لیے سیدھا راستہ بنانے کی کوشش کرے ۔ اِس کے بجائے پانی ایسا کرتا ہے کہ وہ پتھر کے دائیں اور بائیں طرف سے مڑ کر نکل جاتا ہے ۔ وہ پتھر سے ٹکراؤ کو اجتناب (avoid) کرتے ہوئے اپنا راستہ بنا لیتا ہے ۔

میں نے اپنے کشمیری دوستوں سے کہا کہ اِس کو دیکھئے ۔ اِس قسم کے مناظر پورے جموں اور کشمیر میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہ آپ کے نام گویا قدرت کا پیغام ہے، فطرت کا یہ منظر خاموش زبان میں آپ کو بتا رہا ہے کہ چٹان سے نہ ٹکراؤ ، بلکہ چٹان سے بچتے ہوئے اپنا راستہ نکالو ۔

اِس قسم کے چشمے کشمیر کی وادیوں میں سال بھر جاری رہتے ہیں ۔ اس طرح قدرت کا یہ تعمیری پیغام کشمیر میں لاکھوں مقامات پر ہر روز نشر کیا جا رہا ہے ۔ مگر آپ لوگ عین اُسی کے درمیان رہتے ہوئے اُس کو نہیں سنتے ، آپ اُس سے کوئی سبق نہیں لیتے ۔

اِس دنیا میں کامیابی اُس کے لیے ہے جو اختلاف کے موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرے ۔ جو راستہ کی چٹانوں سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر جاری رکھے ۔ ایسا ہی شخص اِس دنیا میں اپنی منزل پر پہنچتا ہے ۔ کشمیر کے لوگوں کو فطرت کی اٹل زبان میں یہ سبق دے کر خدا نے انھیں اس مقام پر کھڑا کیا تھا کہ وہ اِس حکمت کو اختیار کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کریں اور پھر دنیا کو یہ پیغام دے کر دنیا کے رہبر بنیں۔ مگر کشمیر کے لوگ ، شاعر کے الفاظ میں ، خود بے راہ ہو کر اپنے کو برباد کر رہے ہیں ، وہ دوسروں کو کیا رہنمائی دیں گے : او خویشتن گم است کرا رہبری کند

نفع بخشی

آج مسلمان ساری دنیا میں بے قیمت ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے بولنے والوں کو سنیے اور ان کے لکھنے والوں کو پڑھیے تو متفقہ طور پر سب کے سب اس کا ایک ہی سبب بتاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور وہ غیر مسلم اقوام کا تعصب اور ان کا ظلم اور ان کی سازشیں ہیں۔ مگر میں اس قسم کی توجیہہ کو بالکل لغو سمجھتا ہوں۔ اس دنیا کا انتظام براہ راست طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے دنیا کے انتظام کو ہندوؤں یا یہودیوں یا عیسائیوں کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے المیہ کا ذمہ دار غیر مسلم اقوام کو قرار دینا ایک ایسی بات ہے جو زمین و آسمان میں کہیں جگہ پانے والی نہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت خدا کے قانون کے تحت ہے نہ کہ انسانی سازشوں کے تحت۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک، بارش کے بعد ندیوں میں پانی بہنے کی، دوسری، معدنی چیزوں کو صاف کرنے کے لیے انھیں آگ پر تپانے کی۔ دونوں واقعات میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتداءً ان کے اوپر جھاگ آجاتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے بعد دیکھنے والے دیکھتے ھیں کہ بے فائدہ جھاگ پھینک دیا گیا یا ہوا میں اڑ گیا اور ان کے نیچے جو نفع بخش چیز تھی (پانی یا مثلاً چاندی) وہ باقی رہ گیا:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (الرعد ۱۷)

پس جو جھاگ ہے وہ سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہونچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ایک ابدی قانون بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں قوموں کے ساتھ معاملہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ وہ نافع ہیں یا غیر نافع۔ غیر نافع اس دنیا میں "جُفَاء" بن کر رہ جاتا ہے اور نافع کو اس دنیا میں "مَكْث" حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ تعالیٰ کے اسی قانون کی زد میں ہیں۔ آج کی دنیا میں انھوں نے اپنی نفع بخشی کھودی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جفاء (جھاگ) بن کر رہ گیے ہیں، انھیں ساری دنیا میں کہیں بھی مکث (قیام و استحکام) کا درجہ حاصل نہیں۔

ایک سُنّت

مکہ کی فتح (۸ ھ) کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

ثم سلک فی طریق یقال لها الضیقة۔ فلمّا توجّہ فیها رسول الله صلی الله علیه وسلم سأل عن اسمها۔ فقال: ما اسم هذہ الطریق۔ فقیل له الضیقة۔ فقال بل هی الیسریٰ۔
(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۲۷)

پھر آپ اس راستہ میں چلے جس کو ضیقہ (تنگ) کہا جاتا تھا۔ جب آپ نے اس کا رُخ کیا تو آپ نے اس کا نام پوچھا اور کہا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ ضیقہ (تنگ) آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ وہ یُسری (آسان) ہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم و تربیت کا طریقہ کیا تھا۔ وہ آدمی کے طرز فکر کو بدلنا تھا۔ لوگ جس چیز کو "مشکل" کے روپ میں دیکھ رہے ہوں، اس کے متعلق ایسی نظر پیدا کرنا کہ وہ اس کو "آسانی" کے روپ میں دیکھنے لگیں۔ آج ضرورت ہے کہ پیغمبر کی اس سنّت کو زندہ کیا جائے۔ لوگوں کے سوچنے کے طریقہ کو بدلنا اور ان کے ذہن کو درست کرنا ہی آج کرنے کا سب سے بڑا کام ہے۔ اسی کام کے کرنے پر ملّتِ مسلمہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔

موجودہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کو قومی ہیرو کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس کے بجائے ان کے اندر یہ ذہن بنانا کہ پیغمبر ایک قابل تقلید اسوہ ہے۔ آج مسلمان اپنی تاریخ سے فخر کی غذا لے رہے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں تاریخ سے سبق لینے والا بنانا۔ مسلمان اپنے مسائل کو ظلم کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، اس کے بجائے ان کو اس قابل بنانا کہ وہ انھیں چیلنج کی نظر سے دیکھیں۔ مسلمان دوسری قوموں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھے ہوئے ہیں، اس کے بجائے ان کے اندر یہ نگاہ پیدا کرنا کہ وہ دوسری قوموں کو مدعو کی حیثیت دیں اور ان کے ساتھ داعیانہ اخلاق والا معاملہ کریں۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر ایسا فکری انقلاب لانا کہ وہ موجودہ قومی نگاہ کو چھوڑ دیں اور چیزوں کو ربّانی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس چھوڑی ہوئی سنّت کو مسلمانوں میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔

حُسنِ تدبیر

جولائی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں میں راجستھان میں تھا۔ وہاں میری ملاقات جناب مشتاق احمد صاحب (۵۶ سال) سے ہوئی۔ وہ شیوگنج (ضلع سروہی) کے رہنے والے ہیں۔ اور وہاں کے ایک پرانے تاجر ہیں۔ ان کی تجارتی زندگی نے ان کے اندر وہی اخلاقی صفت پیدا کر دی ہے جس کو "یک طرفہ حُسن اخلاق" کہا جاتا ہے۔

انھوں نے ۱۹۸۸ کا ایک ذاتی واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے فساد کو ختم کرنے کے لیے شاہ کلید ہے، بشرطیکہ آدمی اس کی گہرائی کو سمجھے اور اس کو صبر و حکمت کے ساتھ استعمال کرے۔

انھوں نے بتایا کہ رمضان سے کچھ پہلے شیوگنج میں ان کی مسجد کی دیوار پر کسی ہندو نوجوان نے ہندی زبان میں کچھ نعرے لکھ دیے۔ مثلاً "دیش کے لیے جینا سیکھو"۔ "ہندو جاگے گا، دیش جاگے گا"۔ اس طرح کے کچھ اور نعرے تھے جو بظاہر قابل اعتراض اور اشتعال انگیز تھے۔ مگر مشتاق احمد صاحب نہ اس پر غصہ ہوئے اور نہ اس کے خلاف کسی ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے سادہ طور پر صرف یہ کیا کہ دیوار کے اس حصہ کو پانی سے دھو دیا جہاں نعرے لکھے ہوئے تھے۔

رمضان سے پہلے ہر سال ان کی مسجد میں سفیدی ہوتی ہے۔ چنانچہ شعبان کا مہینہ آیا تو مسجد کی دیواروں پر سفیدی کر دی گئی۔ اس طرح نعروں کا نشان مکمل طور پر غائب ہو گیا۔ جہاں پہلے کالی سیاہی سے نعرے لکھے ہوئے تھے، وہاں سفید چمکتی ہوتی دیوار نظر آنے لگی۔

میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ یہی اسلام ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف قومی سرکشی ہے، اس کا اسلام سے یا رسول اللہؐ کی سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر برائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی شرط صرف ایک ہے —— آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی سیاہی پر اپنی طرف سے سفیدی پھیر دے۔ وہ سنتِ رسول کے مطابق سیئہ کو حسنہ کے ذریعہ مٹا دے۔

ذمہ دار کون

حدیث میں آیا ہے کہ ان الفتنۃ نائمۃ لعن اللہ من ایقظھا (بے شک فتنہ سویا ہوا ہے اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس فتنہ کو جگائے) اس حدیث رسول میں دیکھنے کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں حاملین فتنہ پر لعنت نہیں کی گئی ہے بلکہ موقظین فتنہ پر لعنت کی گئی ہے۔ یعنی فتنہ کرنے والوں کو برا نہیں کہا گیا ہے بلکہ ان لوگوں کو برا کہا گیا ہے جو فتنہ کو جگانے کا سبب بنتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنے عمل کی آزادی ہے۔ اس لیے یہاں فتنہ اور حاملین فتنہ کا وجود تو ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہ دنیا کبھی ان سے خالی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انتظام خاص کے تحت ان فتنوں کو سُلا رکھا ہے۔ ابتدائی طور پر وہ خوابیدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص انھیں نہ جگائے تو وہ ان کے شر سے بچا رہے گا۔

ایک سانپ راستہ میں بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ایک نوجوان وہاں سے گزرا۔ اس نے سانپ کو چھیڑا۔ اس نے سوئے ہوئے سانپ کو جگا دیا۔ اس کے بعد سانپ حرکت میں آگیا۔ اس نے نوجوان کو کاٹ لیا۔

اب سمجھ دار آدمی کس کو برا کہے گا۔ سانپ کو یا نوجوان کو۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی نوجوان کو بُرا کہے گا۔ ہر آدمی اس سے کہے گا کہ سانپ جب خاموش پڑا ہوا تھا تو تمہیں اس کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اس سے اعراض کرتے ہوئے اس کے کنارے سے گزر جاتے۔ جب تم نے ایسا نہیں کیا بلکہ سانپ کو چھیڑا تو اب اپنی مصیبت کے ذمہ دار تم خود ہو نہ کہ موذی سانپ۔

ٹھیک یہی انسانی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ انسانی معاشرہ میں بھی ہمیں یہی طریقہ اختیار کرنا ہے کہ ہم سوئے ہوئے "سانپ" کو نہ چھیڑیں۔ ہم اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنے راستہ پر آگے بڑھ جائیں۔ اگر ہم نے انسانی سانپوں کو چھیڑا اور اس کے بعد وہ ہمارے خلاف متحرک ہو گئے تو خدا کے قانون اور رسول کے ارشاد کے مطابق ہم خود اس کے برے نتائج کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔ ہماری کوئی بھی لفظی چیخ پکار ہمیں اس ذمہ داری سے بری قرار نہیں دے سکتی۔